ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور

جنوری 2021

جنرل آصف نواز بار بار کہتے تھے: فوج کو نہ ملکی سیاست سے دلچسپی ہے، نہ ہم اس کے متحمل ہو سکتے ہیں

بھٹو صاحب نے کہا: میں تو پی رہا ہوں، جنرل ضیاء بولے: "Sir you are above the law"

میں نے احتشام کو مشورہ دیا، پنجاب پولیس سے بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ، اس سے انگریز بھی پناہ مانگتا تھا

صدر اسحاق خان نے آرمی چیف سے پوچھا: تمہارا آئی ایس پی آر مجھے ڈاؤن کرنے پر کیوں تلا ہوا ہے؟

آرمی چیف کو شریفانہ انداز میں بھی فارغ کیا جا سکتا تھا

تربیتی مشقوں میں ضیاء الحق کہتے تھے: ہم نے آج نہیں تو کل بھارت سے بدلہ لینا ہے، اس کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے گا جو اس نے ہمارے ساتھ مشرقی پاکستان میں کیا تھا!

بریگیڈیئر (ر) صولت رضا کی انکشاف انگیز یادداشتیں

Scanned with CamScanner

قوم کے ہر فرد کی آواز

روزنامہ پاکستان

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور

جنوری 2021 ⦿ جلد 43 ⦿ شمارہ 1

چیف ایڈیٹر
مجیب الرحمٰن شامی

ایڈیٹر
عثمان شامی

مینجنگ ایڈیٹر
علی شامی

سینئر ایڈیٹر
خالد ہمایوں

یمت: پاکستان: 100 روپے۔ سالانہ چندہ: بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک :1440 روپے، بذریعہ عام ڈاک 1000 روپے ۔ متحدہ عرب امارات: 11 درہم ۔ سعودی عرب: 11 سعودی ریال
رون ملک بدل اشتراک: سعودی عرب، یو اے ای، بحرین، قطر، تھائی لینڈ، چین، جاپان، کوریا، ہانگ کانگ، سنگاپور، مالدیپ، ڈنمارک، ناروے، فرانس، سویڈن، ہالینڈ، بلجیم،
تان، جرمنی، برطانیہ 4000 روپے انڈونیشیا، ملائیشیا، نائیجریا، جنوبی افریقہ، بھارت، لیبیا، سوڈان، بنگلہ دیش 4000 روپے، آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ 4500 روپے

د وکتابت کا پتہ: دفتر ماہنامہ قومی ڈائجسٹ 41 جیل روڈ لاہور، فون: 65-042-35404061
فیکس: 67-042-35404066

Email
qaumidigestpak@gmail.com

مجیب الرحمٰن شامی پرنٹر پبلشر نے قومی پریس سے چھپوا کر 41 جیل روڈ لاہور سے شائع کیا

Scanned with CamScanner

قلمبندی: عبدالستار اعوان

بریگیڈیئر (ر) صولت رضا

بریگیڈیئر (ر) صولت رضا 6 اکتوبر 1952ء کو سید رفاقت حسین کے ہاں پشاور میں پیدا ہوئے۔ جو ایک سرکاری ملازم کے طور پر وہاں متعین تھے۔ ابتدائی تعلیم ڈی پی نیشنل سکول ٹیونیشیا لائنز کراچی سے حاصل کی۔ ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن لاہور سے میٹرک، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے انٹرمیڈیٹ، اسلامیہ کالج سول لائنز سے بی اے اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے صحافت کیا۔ 1971ء میں پاک آرمی جوائن کی اور پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے تربیت حاصل کی۔ پاسنگ آؤٹ کے بعد توپ خانہ کی ایک یونٹ ''23 فیلڈ رجمنٹ آرٹلری'' میں تعینات کیے گئے۔ اکتوبر 1973ء میں ان کی خدمات مستقل طور پر پاک فوج کے شعبہ تعلقات عامہ ''انٹر سروسز پبلک ریلیشنز'' کے حوالے کر دی گئیں۔ جولائی 2003ء میں آئی ایس پی آر سے بطور بریگیڈیئر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

صولت رضا نے اپنی کتاب ''کاکولیات'' سے بہت شہرت پائی۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن 1975ء میں شائع ہوا اور اس کا 27 واں ایڈیشن 2012ء میں شائع ہوا۔ یہ معلوم ایڈیشنز کی تعداد ہے جو مصنف کے پبلشر نے شائع کیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کے ''نامعلوم ایڈیشنز'' کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں زیر تربیت ایک کیڈٹ کی دلچسپ آپ بیتی ہے۔ پیش لفظ میں ممتاز ادیب بریگیڈیئر صدیق سالک نے لکھا: ''کیپٹن صولت رضا سنگلاخ فوجی زمین سے پھوٹنے والا ایک تازہ چشمہ ہے۔ اسی زمین سے پھوٹنے والے کئی چشمے مثلاً کرنل فیض احمد فیض، میجر چراغ حسن حسرت، میجر جنرل شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان اور میجر ضمیر جعفری پہلے ہی دریا اور پھر سمندر بن چکے ہیں۔ صولت رضا میں بھی چشمہ سے سمندر بننے کی صلاحیت موجود ہے''۔

جناب صولت رضا نے مختلف فوجی اور سیاسی ادوار کو بہت قریب سے دیکھا۔ قومی ڈائجسٹ کو یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے کہ صولت رضا کی یادداشتیں پہلی بار ان صفحات پر شائع ہو رہی ہیں۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

میری پیدائش پشاور میں ہوئی جہاں میرے والد گرامی سید رفاقت حسین سرکاری ملازمت کے سلسلے میں تعینات تھے۔ قومی شناختی کارڈ کے مطابق میری تاریخ پیدائش چھ اکتوبر 1952ء ہے۔ بچپن کی ابتدائی یادیں پشاور کے بجائے مشرقی پاکستان کا شہر ''کومیلا'' حاوی ہے۔ شہر کے قریب ہی چھاؤنی کا علاقہ تھا جس کے رہائشی علاقے میں واقع سرکاری کوارٹر میں سے ایک میں ہم رہتے تھے۔ ہم میں والد، والدہ اور میرے سمیت تین بچے تھے۔ دو بہنیں مجھ سے چھوٹی تھیں۔ ہم میں سے کوئی بھی اسکول جانے کی عمر میں نہیں تھا۔ لہذا گھر پر ہی مقیم تھے۔ والد صاحب پشاور سے تبدیل ہو کر کومیلا چھاؤنی آ گئے تھے۔ ان کی ملازمت ملٹری انجینئرنگ سروسز (ایم ای ایس) کے سول سٹاف میں تھی۔ بچپن کی انمٹ یادوں میں گھر کے سامنے سرسبز میدان، شدید بارش، گھنے درخت، پرندوں کی دن بھر چہچہاہٹ اور صبح سویرے گائے کے دودھ کا گلاس پینا شامل ہے۔ اے بی سی اور الف انار، ب بکری کا قاعدہ بھی تھا۔ ایک اور خاص بات یہ کہ ڈھاکہ کے گلاب جامن تھے۔ والد صاحب جب بھی سرکاری کام کاج سے ڈھاکہ جاتے تو واپسی پر ہمارے لیے گلاب جامن ضرور لایا کرتے تھے۔ گلاب جامن کے بارے میں والدین کی گفتگو کے دوران پتہ چلا کہ ابا جی (والد گرامی) کا نام ''رضی کے ابا'' ہے۔

رضی میرا گھریلو نام تھا۔ یوں امی جان والد گرامی کو ''رضی کے ابا'' کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔

کومیلا (مشرقی پاکستان) میں دو برس گزارنے کے بعد ''رضی کے ابا'' کی کراچی پوسٹنگ ہوگئی۔ ان کا دفتر ویسٹ وہارف کے قریب تھا لیکن رہائش کے لئے سرکاری کوارٹر ٹیونیشیا لائنز میں الاٹ ہوا تھا۔ یہ 1956ء کا ذکر ہے۔ کوارٹر ٹیونیشیا لائنز کراچی میں رہائش پذیر اکثریت سرکاری ملازمین کی تھی۔ یہ انگریز دور کی تعمیر کردہ بیرکس تھیں جنہیں رہائش گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہر گھر دو بڑے کمروں، صحن، برآمدوں، کچن، واش روم وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے سڑک کے اس پار سینٹ پیٹرکس سکول کی سپورٹس گراؤنڈ تھی جہاں صرف اسکول کے طلبہ ہی داخل ہو سکتے تھے۔ اس گراؤنڈ کے ارد گرد ہزاروں جھگیاں تھیں جہاں مہاجرین مقیم تھے۔ مَیں کوارٹر ٹیونیشیا لائنز میں واقع ڈی پی نیشنل ہائی سکول میں جماعت اول میں داخل ہوا۔ پہلے روز امی جان نے لکیردار پاجامہ اور ململ کا سفید کرتا پہنایا۔ تختی اور بستہ تھما کر میرے تایازاد بھائی توقیر مہدی کے حوالے کیا کہ اسے کلاس میں چھوڑ آؤ۔ کلاس میں بیٹھے چند سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ توقیر بھائی کو جاتا دیکھ کر واپس ان کے پیچھے پیچھے گھر آ گیا۔ والدہ محترمہ بہت ناراض ہوئیں۔ ابھی ڈانٹ ڈپٹ ہو رہی تھی کہ والد گرامی گھر تشریف لائے۔ انہوں نے اسکول کے بھگوڑے کی ایسی دھنائی کی جو آج بھی نہیں بھولتی۔ چھترول سے

والد گرامی گھر تشریف لائے، انہوں نے سکول کے بھگوڑے کی ایسی دھنائی کی جو آج بھی نہیں بھولتی

Scanned with CamScanner

والدہ صاحبہ بتاتی تھیں کہ ہم نے خود پاکستان کا پرچم بنایا اور اسے ٹرین کے انجن پر لہرا دیا تھا

فارغ ہو کر انہوں نے تو قیر بھائی سے کہا کہ اسے دوبارہ کلاس میں بٹھا کر آؤ۔ اب کبھی سکول سے نہیں بھاگے گا۔ واقعی سکول تو کیا ہم کبھی کالج یا یونیورسٹی کی کلاس سے بھی غیر حاضر نہیں رہے۔

کوارٹر ٹیونیشیا لائنز کے قریب جیٹ لائنز اور جیکب لائنز ہیں۔ جیکب لائنز میں میرے نانا سید رفیق احمد قیام پذیر تھے جو وفاقی حکومت کے محکمہ مالیات میں ملازمت کرتے تھے اور قیام پاکستان کے بعد دیگر مسلمان ملازمین کے ساتھ دہلی سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے تھے۔ نانا جی ابتداء سے ہی دہلی میں مقیم تھے۔ انہوں نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا۔ میری والدہ محترمہ بتایا کرتی تھیں کہ پاکستان آنے والی ٹرین میں سفر کے دوران مسلسل بے پناہ مسرت اور ایک انجانے خوف کی کیفیت ہم پر طاری رہی تھی۔ والدہ بیان کرتیں کہ کس طرح ہم نے خون کے دریا عبور کر کے یہ وطن حاصل کیا تھا۔ والدہ صاحبہ بتاتی تھیں کہ ہم نے خود پاکستان کا پرچم بنایا اور اسے ٹرین کے انجن پر لہرا دیا تھا۔ میرے نانا جان ہمیشہ قومی لباس ہی زیب تن کرتے تھے۔ شیروانی، جناح کیپ، کرتا اور پاجامہ ہی پہنا کرتے۔ گھر میں اردو کا رواج تھا۔ البتہ جب پنجاب سے رشتہ دار آتے تو گھر میں پنجابی ہی کی گونج سنائی دیتی تھی۔ دراصل ہمارے خاندان کا تعلق ضلع نارووال کے ایک قدیم گاؤں سنکھترہ سے ہے جو اب تحصیل ظفروال میں شامل ہے۔ آغاز میں ضلع سیالکوٹ تھا۔ سنکھترہ کے سادات خاندان سے تعلق رکھنے والے مختلف خاندان بسلسلہ ملازمت و کاروبار وغیرہ پاکستان کے مختلف شہروں میں مقیم ہو گئے۔ ایک دو نسل کے بعد وہیں کے ہو رہے۔ نانا جی کا خاندان پہلے ''دہلی والے'' کہلاتے پھر ''کراچی والے'' ہو گئے۔ نانا جی ریٹائر ہوئے تو میرے اکلوتے ماموں سید سعید الحسن لاہور میں واپڈا ہیڈ کوارٹرز میں تعینات تھے۔ لہذا ''کراچی والے'' کچھ عرصے بعد ''لاہور والے'' ہو گئے۔ سنکھترہ سے آبائی تعلق رکھنے والے متعدد گھرانے اندرون سندھ آباد ہیں اور ان کی گھریلو زبان سندھی ہے۔ بیرونی ممالک بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ اکثر تقریبات میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ تاہم گاؤں میں ان کی آمد سیاح کے طور پر ہوتی ہے کیونکہ آبائی گھر مسمار ہو چکے ہیں یا اردگرد کے مقامی افراد نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہمارے آبائی گاؤں کے حوالے سے سید نذیر نیازی اپنی کتاب ''اقبال کے حضور'' میں رقمطراز ہیں کہ: ''ایک روز علامہ اقبالؒ نے اپنے خاندان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ان کے آباؤ اجداد نے قبول اسلام کے بعد کشمیر سے ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں سنکھترہ ہجرت کی اور برسوں یہاں مقیم رہے''۔ سنکھترہ میں قیام کے دوران ایک بار کسی غیر مسلم جاگیردار نے سادات خاندان کے سربراہ سے کہا کہ وہ اپنے سید ہونے کا ثبوت پیش کرے۔ جاگیردار کا اصرار تھا کہ سادات کو آگ نقصان نہیں

Scanned with CamScanner

پہنچاتی لہذا بزرگ سید کو اپنا نسب صحیح ثابت کرنے کے لیے آگ کے الاؤ میں بیٹھنا ہوگا۔ جاگیردار کے حکم پر آگ روشن کی گئی۔ بزرگ سید ایک سبز عبایا اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے۔ سیکڑوں افراد جاگیردار کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب آگ سرد ہوئی تو بزرگ قرآنی آیات کی تلاوت فرماتے ہوئے زندہ موجود تھے۔ اس واقعہ کے بعد جاگیردار معافی کا طلب گار ہوا اور اپنے خاندان اور دیگر ہم ذات لوگوں کو تلقین کی کہ سادات کے ساتھ عزت و تکریم کے ساتھ پیش آئیں اور محلّہ سادات میں ننگے پاؤں داخل ہوا کریں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ بزرگ سید نے ان کے خاندان کو خصوصی دعا دی اور وہ سیالکوٹ شہر چلے گئے جہاں کاروبار کی بدولت حالات بہت بہتر ہوئے، اس کے ساتھ تعلیم اور علم کے میدان میں بھی خاندان کے افراد ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ علامہ اقبال کے خاندان کے حوالے سے ہمارے بزرگ بھی مختلف اجتماعات میں واقعات بیان کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھے تھے۔

ڈی پی نیشنل ہائی سکول لائنز ایریا کراچی میں کلاس نہم تک تعلیم حاصل کی۔ کلاس نہم کا امتحان بھی بورڈ کا تھا۔ بدقسمتی سے امتحان شروع ہونے سے ایک ماہ قبل مجھے ٹائی فائیڈ نے آگھیرا۔ شدید بخار اور تکلیف کے باعث موزوں تیاری نہ ہوسکی۔ رول نمبر سلپ مل چکی تھی۔ اس دوران والد گرامی کو کراچی سے لاہور پوسٹنگ کا حکم نامہ مل گیا طبیعت ذرا سنبھلی تو امتحان میں شرکت کا فیصلہ کرلیا۔ طارق روڈ کے قریب ایک سرکاری سکول سنٹر تھا۔ نانا جی مجھے روزانہ کمرہ امتحان تک پہنچاتے اور پرچہ مکمل ہونے تک باہر برآمدے میں بیٹھے رہتے تھے۔ میں ان کی بڑی بیٹی کا بڑا بیٹا تھا۔ یوں ننھیال پیار اور شخصیت کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک دو پرچے بخار کی کیفیت کے باعث مکمل نہ ہوئے۔ جماعت نہم کا نتیجہ اعلان سے قبل واضح تھا۔ لاہور پہنچے تو عارضی قیام ماڈل ٹاؤن میں مقیم والد گرامی کی بڑی ہمشیرہ کے ہاں کیا۔ ابھی لاہور چھاؤنی میں سرکاری گھر الاٹ نہیں ہوا تھا۔ مجھے ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن میں جماعت دہم میں داخل کرادیا گیا، نہم اور دہم کا امتحان ایک ساتھ ہونا تھا لہٰذا اسکول میں دہم اور اسکول کے باہر نہم کی تیاری شروع ہوگئی۔ یہ سن ساٹھ / باسٹھ کا ماڈل ٹاؤن تھا۔ انتہائی پرسکون بستی، جہاں سب جان پہچان والے خاندان آباد تھے۔ آم، جامن کے درختوں کی بہتات اور ایف سی کالج نہر کے پانی کی روانی۔ ماڈل ہائی سکول سی بلاک کے ایک پرائیویٹ گھر میں قائم تھا۔ انگریزی کے ماسٹر خدا بخش صاحب تھے۔ ان کا جلال بہت مشہور تھا، دو تین مرتبہ میرے ہاتھ بھی بیدزنی کا نشانہ بنے۔ ایک مرتبہ کلاس سے نکل کر سکول کی گھنٹی بجادی تو پکڑے گئے اور سیدھے ماسٹر خدا بخش کے روبرو رضا کارانہ اقبال جرم کے باوجود خوب دھنائی ہوئی۔

جب آگ سرد ہوئی تو بزرگ قرآنی آیات
کی تلاوت فرماتے ہوئے زندہ موجود تھے
اس واقعہ کے بعد جاگیردار معافی کا طلب گار ہوا

Scanned with CamScanner

انگریزی پروفیسر ایرک سپرئین اور پروفیسر امین مغل ایسے ماہر اساتذہ پڑھاتے تھے، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ ہو یا سول لائنز، فیکلٹی ممبران کی اکثریت کی صلاحیت، قابلیت اور تدریس سے لگاؤ بہت مثالی تھا

ماڈل ٹاؤن میں کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کے لیے وسیع و عریض گراؤنڈ موجود تھے۔ ہم نے بھی جی بلاک میں کرکٹ ٹیم بنا رکھی تھی۔ بہرحال ماڈل ٹاؤن سے بہت خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ والد صاحب کو جب لاہور چھاؤنی میں گھر ملا تو میں میٹرک پاس کر چکا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈی پی نیشنل ہائی سکول لائنز ایریا کراچی اور ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن لاہور کے اساتذہ کرام کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ یقین جانیے کہ جس دل جمعی اور استقامت کے ساتھ اساتذہ ہم ایسے طالب علموں کی تعلیمی استطاعت بڑھانے کے لیے کوشاں رہتے تھے، وہ ہر لحاظ سے مثالی رویہ تھا۔

سکول کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ مرکز نگاہ تھا۔ سبز پاکستانی کلر کا کوٹ، گرے رنگ کی پتلون، سفید شرٹ اور گرین وائٹ ٹائی۔ اس ڈریس کی اپنی ہی ایک شان تھی۔ لاہور چھاؤنی سے اومنی بس سروس کی ڈبل ڈیکر بس ریلوے سٹیشن تک آتی تھی۔ اسٹیشن سے کالج تک پیدل راستہ طے ہوتا تھا۔ کالج بروقت پہنچنے کے لیے گھر کے قریب بس سٹاپ پر پہنچتے تھے۔ ڈبل ڈیکر بس میں اوپر کی منزل میں کھڑکی کے پاس بیٹھنے کا جنون تھا۔ بس کا رڈ بنا ہوا تھا۔ راستے میں دو تین کلاس فیلو بھی بس میں سوار ہوتے تھے۔ یوں آخری سٹاپ ریلوے سٹیشن سے کالج تک پیدل مارچ کی بوریت ختم ہو جاتی تھی۔ بغیر ٹکٹ سفر کا تصور نہیں تھا۔ لاہور اومنی بس بہت بڑی سہولت تھی۔ بعد میں جی ٹی ایس بس سروس کی طرح یہ سروس بھی لاپتہ ہو گئی اور ہمارے ایسے کئی ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں بہترین اساتذہ موجود تھے۔ انگریزی پروفیسر اقبال صاحب جبکہ اردو ڈاکٹر احرار نقوی پڑھاتے تھے۔ میں آرٹس میں سوکس اور اکنامکس کا طالب علم تھا۔ غیر نصابی سرگرمیاں اور سپورٹس عروج پر تھے۔ کالج کے وائس پرنسپل مولانا علم الدین سالک کا سراپا تو آج بھی گیٹ پر بلیک رول تھامے نظر آتا ہے۔ شیروانی اور شلوار میں ملبوس جناح کیپ پہنے ہر آنے والے طالب علم کو شیر کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہ اگر آنکھیں چار ہو جائیں تو خون کی روانی رک جائے۔ کالج ڈریس میں معمولی کوتاہی بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ تاخیر سے آنے والوں کے لیے جواب طلبی کے لمحات مزید ''اذیت ناک'' تھے۔ کالج آئے چند ماہ گزرے ہوں گے کہ گورنمنٹ کالج لاہور سے کرکٹ فائنل میچ کی نوبت پہنچ گئی۔ اقبال پارک میں معرکہ برپا تھا تو یہی پروفیسر علم الدین سالک صاحب طلباء کے ساتھ کالج ٹیم کا حوصلہ بڑھانے میں پیش پیش تھے۔ گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج کے مابین سپورٹس کے معرکے ہر لحاظ سے بین الاقوامی معیار کے ہوتے تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم، ٹیموں کا چناؤ اور میدان میں مکمل وابستگی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔ کسی کالج کے لیے شکست تو ناممکنات میں تھی۔ ریلوے روڈ کی ٹیم کالج

Scanned with CamScanner

کی گراؤنڈ میں ہی نیٹ پریکٹس کرتی تھی۔ کبھی کبھار میں بھی بالنگ یا باؤنڈری کے باہر جاتی ہوئی گیند اٹھانے پر ازخود ہی مامور ہو جاتا تھا۔ لیکن میرے لیے بیٹنگ کرنا بہت مشکل تھا۔ دراصل کلاس کے طالب علم اور میدان کے طالب علم دو مختلف ''راہیں'' تھیں۔ میرے خاندانی پس منظر اور حالات میں کرکٹ محض مشغلہ تھا۔ والد صاحب بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بہترین سامان خرید کر دیا تھا۔ لیکن اولین ترجیح تعلیم ہی تھی۔ اتوار کرکٹ کے لیے مختص تھا۔ لاہور چھاؤنی کی شاید ہی کوئی گراؤنڈ رہ گئی ہو جہاں ہم نے دن بھر کرکٹ نہیں کھیلی۔ البتہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی ٹیم میں شمولیت خواب ہی رہا۔ اس زمانے میں سلیکشن کا معیار بہت بلند تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے مقابلے کے باعث میرٹ کو اہمیت حاصل تھی۔ تقریباً ایسا ہی ماحول گورنمنٹ کالج میں تھا۔ وہاں بھی سپورٹس کے میدان میں پیش قدمی کے لیے سخت محنت مطلوب تھی۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے دور کا ایک اہم واقعہ انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ تھا جو کالج گراؤنڈ میں منعقد ہوا۔ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مہمان خصوصی تھے۔ انجمن کے صدر سید محسن شاہ (جسٹس نسیم حسن شاہ کے والد گرامی) اور دیگر اکابرین ڈائس پر موجود تھے۔ مجھے دیگر ہم جماعت طلبا کے ہمراہ سٹیج کے نزدیک بٹھایا گیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کو دوسری مرتبہ بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل کراچی میں قیام کے دوران ایوب خان کو برطانوی ملکہ ایلزبتھ کے ہمراہ کھلی کار میں ڈرگ روڈ (موجودہ شاہراہ فیصل) سے گزرتے دیکھا تھا۔ ہم گورا قبرستان کے ساتھ فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ ایک کھلی کار میں جو معمول سے کم رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی، ایوب خان اور ملکہ برطانیہ سوار تھے۔ ایوب خان بلند قامت، سرخ و سپید چہرہ اور اس پر شاندار وردی کی چمک۔ قریب ملکہ برطانیہ خوبصورت گڑیا کی مانند ہم رکاب تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے صدر پاکستان نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے طلبا کی تحریک پاکستان میں گرانقدر خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ انہوں نے اپنی مادر علمی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بھی بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا۔ انجمن حمایت اسلام کے کامیاب جلسے کی خوشی میں کالج میں دو روز کی تعطیل کا اعلان کیا گیا جسے ہم نے فیلڈ مارشل ایوب خان کی جانب سے تحفہ قرار دیتے ہوئے فلک شگاف نعرے بازی کی۔ میرا 1964-1962ء کا سیشن تھا۔ اساتذہ کرام سلیبس مکمل کرانے کی سعی میں مصروف تھے۔ ہماری توجہ کے اصل مراکز کرکٹ گراؤنڈ اور حبیبیہ ہال تھے۔ کالج کی غیر نصابی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ حبیبہ ہال میں ہفتہ وار اہم شخصیات کے لیکچرز میں حاضری لازمی تھی۔ ایک اور واقعہ یاد آیا۔

ہمارے ایک پرجوش ساتھی راشد بٹ (مرحوم)
نے کالج انتظامیہ سے ضد کر کے بھٹو صاحب کو
کالج میں دعوتِ خطاب دی

Scanned with CamScanner

مجھے جناب عبدالسلام خورشید کی آواز سنائی دی ''میرا خیال ہے چل جائے گا''

چوک دال گراں میں پٹھورے چنے کا ٹھیلا تھا۔ میں کالج سے واپسی پر چند منٹ کے لیے رکتا اور ہلکی پھلکی پیٹ پوجا کر کے پیدل اسٹیشن روانہ ہو جاتا تھا۔ ایک روز یہ نیک عمل انجام دے رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کان مروڑتے ہوئے انگریزی میں ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ یہ ہمارے انگریزی کے پروفیسر اقبال صاحب تھے جو سائیکل پر دھرم پورہ سے کالج آتے تھے۔ انہوں نے کالج یونیفارم میں ٹھیلے پر لنچ تناول کرنے پر غم و غصے کا اظہار کیا۔ اگلے روز کلاس میں بھی نشست سے کھڑا کر کے دوبارہ جھاڑ پلائی۔ قریب تھا کہ ایک دو بید بھی رسید کر دیتے لیکن انہیں رحم آ گیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد فطری ترجیح اسلامیہ کالج سول لائنز تھا۔ لازمی انگریزی کے ساتھ اکنامکس اور پولیٹیکل سائنس اہم مضامین تھے۔ اس کالج میں بھی دو برس 1967-1966ء بھرپور طور پر گزرے۔ پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ پروفیسر گلزار محی الدین تھے جب کہ ہمارے کلاس لیکچرار پروفیسر محمد سرور تھے۔ انگریزی پروفیسر ایرک سپرئین اور پروفیسر امین مغل ایسے ماہر اساتذہ کے حوالے تھی۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ ہو یا سول لائنز، فیکلٹی ممبران کی اکثریت کی صلاحیت، قابلیت اور تدریس سے لگاؤ بہت مثالی تھا۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کا دیدار نصیب ہوا تو اسلامیہ کالج سول لائنز میں ایوب خان کے ناراض ساتھی اور سابق وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو سے مصافحہ قسمت میں لکھا تھا۔ بھٹو صاحب لاہور میں پیپلز پارٹی کے قیام کے سلسلے میں قیام پذیر تھے۔ ہمارے ایک پرجوش ساتھی راشد بٹ (مرحوم) نے کالج انتظامیہ سے ضد کر کے بھٹو صاحب کو کالج مدعو کرنے کی ٹھان لی۔ یہ پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کا فنکشن تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنی شعلہ بیانی اور مخصوص انداز تخاطب کے باعث عوام میں روز بروز مقبول ہو رہے تھے۔ خاص طور سے نوجوان ان کے شیدائی تھے۔ اسلامیہ کالج سول لائنز کے وسیع لان میں شامیانہ نصب کیا گیا۔ صدر شعبہ پروفیسر گلزار محی الدین خود نگرانی کر رہے تھے۔ راشد بٹ کی خوشی دیدنی تھی۔ بھٹو صاحب تشریف لائے۔ خطبہ استقبالیہ کے بعد پرجوش خطاب شروع ہو گیا۔ میں ڈائس کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ کر بھٹو صاحب کی تقریر سن رہا تھا جو بین الاقوامی مسائل اور مستقبل کی سیاست کا احاطہ کر رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس اجتماع میں بھٹو صاحب نے بیگم زاہدہ خلیق الزمان پر پھبتی کسی جو آئندہ کئی دن تک اخبارات میں موضوع بحث رہی۔ بھٹو صاحب کامیاب جلسے کے بعد اسلامیہ کالج سول لائنز سے روانہ ہو گئے اور راشد بٹ کو اساتذہ اور طلبہ سے مبارکباد وصول کرنے کے لیے چھوڑ گئے۔

گریجوایشن کے بعد ایم اے (ماسٹر ڈگری)

Scanned with CamScanner

میں داخلے کا مرحلہ تھا۔ میری دلچسپی وکالت اور صحافت کی جانب تھی۔ وکالت سے پسندیدگی کا سبب قائد اعظم محمد علی جناح کی مثالی شخصیت تھی۔ ہمارے گھر میں بچپن سے روزنامہ اخبار آتا تھا۔ شاید گوشت، سبزی یا کسی اور شئے کا ناغہ ہو جائے لیکن اخبار کا کبھی ناغہ نہیں ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان میں بھی والد صاحب باقاعدگی سے نوائے وقت لاہور بذریعہ ڈاک منگوایا کرتے تھے۔ تب مجھے پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا لیکن ''نوائے وقت'' کی پیشانی تصویر کی صورت میں آج بھی یاد ہے۔ کراچی پہنچے تو روزنامہ انجام شروع ہو گیا۔ اپنی بساط کے مطابق ہجے کر کے خبریں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ نانا جی کے گھر جیکب لائنز میں ''ڈان'' اخبار کا بسیرا تھا۔ کراچی سے والد صاحب کی پوسٹنگ لاہور ہو گئی تو ''انجام'' کی جگہ روزنامہ مشرق نے لے لی۔ مشرق ایک مکمل اخبار تھا۔ اس کے بانی عنایت اللہ نے جدید خطوط پر نئی طرز کے روزنامے کی بنیاد رکھی جو بے حد کامیاب رہی۔ خبریں، اداریے اور کالم، فیچر، تصاویر اور سب سے بڑھ کر کئی رنگوں میں پرکشش اشاعت۔

قصہ مختصر کہ میں نے لاء کالج اور شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں داخلے کے لیے فارم پر کر دیئے۔ لاء کالج سے انٹرویو کی کال آ گئی۔ دوسری جانب شعبہ صحافت میں پہلے تحریری امتحان ہوا اور اس کے بعد انٹرویو کا مرحلہ درپیش تھا۔ تحریری امتحان پاس کرنے کے بعد انٹرویو کی قطار تھی، جب میری باری آئی تو میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب ''فن صحافت'' اور اپنے چند شائع شدہ مضامین تھامے صدر شعبہ صحافت کے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب کے ساتھ مسکین حجازی، جناب وارث میر، جناب مہدی حسن اور جناب محی الدین احمد تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے مضامین پر سرسری نگاہ ڈالی جو ''نوائے وقت'' کے تعلیمی صفحے میں شائع ہوئے تھے۔ محترم وارث میر نے ''فن صحافت'' کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ کل فیروز سنز سے یہ کتاب خریدی ہے اور ابھی پہلا باب ہی پڑھا ہے۔ بہر حال انٹرویو ختم ہوا۔ میں باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب بڑھا اور جان بوجھ کر اپنی رفتار آہستہ کر دی، دروازے سے نکلتے ہوئے مجھے جناب عبدالسلام خورشید کی آواز سنائی دی ''میرا خیال ہے چل جائے گا'' باقی تمام محترم ممبران نے جی جی کہا۔ اب میں پورے اطمینان کے ساتھ شعبہ صحافت سے گھر روانہ ہوا۔ دو روز بعد کامیاب امیدواروں کی فہرست نوٹس بورڈ پر چسپاں تھی اور دس بارہ طلباء و طالبات کے بعد میرا نام بھی تھا۔ کل پچیس سلیکٹ ہوئے تھے جن میں تیرہ طالبات اور بارہ طلباء تھے۔

1969-70ء کے سیشن میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں داخلے سے قبل پروفیسر وارث میر سے میری شناسائی نہیں تھی۔ یہ شعبہ اب ترقی کی کئی منازل طے کر چکا ہے اور شعبہ ابلاغیات (ماس

مارچ 71ء میں قومی اسمبلی کا مجوزہ اجلاس ملتوی ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کے شہریوں کو یقین ہو گیا کہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے اقدامات سے پاک فوج کا وقار اور کریڈیبلٹی شدید متاثر ہوئے

Scanned with CamScanner

ہماری تیاری صفر تھی، لہٰذا دنیا بھر میں ہماری رسوائی ہوئی اور سبق یہ ملا کہ سیاسی، عسکری، معاشی اور ابلاغی حقائق سے آنکھیں بند کر کے فاتحانہ پیش قدمی کی امیدیں کرنا خود فریبی کے مترادف ہے

کمیونی کیشن) کہلاتا ہے۔ خیر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ تحریری امتحان اور انٹرویو کے مراحل کامیابی سے طے ہوگئے اور ہم ایک روز سیاہ گون پہن کر ایم اے صحافت کی کلاس میں داخل ہوئے تو کامرانی کے احساس سے حد نگاہ تک فضا چکا چوند تھی۔ اساتذہ کرام میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صدر شعبہ تھے، جو اپنی قابلیت، تجربے اور صحافتی اثر و رسوخ کے باعث سایہ دار شخصیت کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر مسکین حجازی، وارث میر، پروفیسر مہدی حسن اور پروفیسر محی الدین نمایاں تھے۔ پروفیسر محی الدین کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور بنگلہ دیش کے وجود میں آتے ہی وہ ڈھاکہ واپس چلے گئے۔

والد صاحب کا اصرار تھا کہ میں وکالت یا ایم اے پولیٹیکل سائنس کی ڈگری حاصل کر کے مقابلے کے امتحان سی ایس ایس میں قسمت آزمائی کروں، ادھر ہم پر ''مخلوط'' صحافت کا جادو چل چکا تھا۔ شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی میں داخلے کے بعد زندگی کے شب و روز بدل گئے۔ کرکٹ سے فاصلے بڑھ گئے۔ شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کی عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ کلاس روم کے برآمدوں سے نہر دکھائی دیتی تھی۔ ہمارے زمانے میں نہر کے اُس پار سڑک تھی۔ شعبہ صحافت اور نہر کے مابین ایک سرسبز میدان تھا جہاں ہم آف پیریڈ میں منڈلی جمائے رکھتے تھے۔ نہر کنارے واقع ٹی سٹال بھی ہماری سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا جہاں ہاف سیٹ یا فل سیٹ چائے پر کئی گھنٹے ''لیفٹ رائٹ'' کرتے رہتے تھے۔ یہ لیفٹ رائٹ عسکری نہیں بلکہ نظریاتی تھی۔ دایاں بازو اور بایاں بازو کی تقسیم در تقسیم نے یونیورسٹی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سیاسی نظریاتی اور فکری بحث مباحثہ میں طلباء وطالبات کی مختصر تعداد ہی ''ملوث'' تھی۔ اکثر کے کلاسز کے بعد مشاغل کچھ اور ہی نوعیت کے تھے۔ یونیورسٹی کیفے ٹیریا فاصلے پر تھا وہاں خاص مواقع پر ہی بزم دوستاں سجا کرتی تھی۔

پنجاب یونیورسٹی میں دو برس کا قیام لاتعداد خوشگوار یادیں اور سحر انگیز لمحات سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ ناخوشگوار واقعات کا بھی ایک سلسلہ ہے۔ یہ دنیا کی دھوپ چھاؤں ہے جس کا اصل ادراک عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ شعبہ صحافت میں ابھی جان پہچان کے دور ہی سے گزر رہے تھے کہ ایک روز استاد مکرم پروفیسر مسکین علی حجازی نے مجھے اور ہم جماعت اجمل ملک مرحوم (سابق ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ خیبر پختونخواہ) کو چیئرنگ کراس کے بس سٹاپ پر کھڑے دیکھ کر اپنی کار روک لی۔ ہم سمجھے کہ شاید کار میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہے لہٰذا دھکا وغیرہ لگانا ہوگا۔ انہوں نے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سروس روڈ سے ہوتے ہوئے شاہ دین بلڈنگ کے قریب کار

Scanned with CamScanner

پارک کر دی۔ حجازی صاحب گاڑی سے باہر آئے اور ہم دونوں کو اپنے ہمراہ نوائے وقت کے دفتر لے گئے۔ تب نوائے وقت شاہ دین بلڈنگ سے شائع ہوتا تھا۔ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے فرمانے لگے کہ کلاسز ختم ہونے کے بعد ادھر ادھر گھومنے کے بجائے عملی صحافت سیکھو، زندگی میں کام آئے گی۔ نوائے وقت میں سینئر نیوز ایڈیٹر سید ظہور عالم شہید (مرحوم و مغفور) تشریف فرما تھے۔ انہوں نے چند سوالات کیے اور ہم دونوں کو سینئر سب ایڈیٹر ممتاز ملک صاحب کے حوالے کر دیا جنہوں نے اے پی پی کی انگریزی کریڈ ترجمے کے لیے ہمارے آگے بڑھا دی۔ اب اجمل ملک کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہم چھ بجے سے نو بجے شب کا فلم شو الفلاح سینما میں دیکھنے کے لیے ''زادہ راہ'' ہمراہ لائے تھے۔ ادھر حجازی صاحب نے عملی صحافت سیکھنے پر مامور کر دیا تھا۔ بہر حال کسی طرح نصف شب تک خبریں ترجمہ کرتے رہے اور پورے نیوز روم میں ہماری قابلیت کی قلعی وقفے وقفے سے کھلتی گئی۔

''اوئے تہاڈے استاد کیہ پڑھاندے نیں۔ تسی تے دولائناں لکھ نئیں سکدے''۔

''تہانوں انٹرویو دا پتہ نئیں''۔

کسی نے آواز لگائی کہ ''فارغ کردوان دونوں کو''۔

آخر کار ظہور عالم شہید صاحب نے فیصلہ سنایا کہ کل سے شام چھ بجے باقاعدہ آنا ہوگا۔ اپرنٹس کے دو سو روپے ماہانہ ملتے ہیں۔ رات دو بجے تک ڈیوٹی ہوگی۔ شاہ دین بلڈنگ سے باہر آئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہم نے کرایہ بانٹ کر رکشا لیا اور نیو کیمپس پہنچ گئے۔ اپرنٹس سب ایڈیٹر دو سو روپے ماہوار اور رات دو بجے تک ڈیوٹی۔ کبھی اجمل ملک لڑکھڑا جاتا اور کبھی میں مایوسی کا شکار ہو جاتا تھا۔ دن نکلا۔ ہوسٹل سے کلاس روم پہنچے تو پروفیسر حجازی صاحب نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا کہ دو سو روپے ماہانہ کافی ہوں گے۔ شاباش۔ اور ہماری شب بیداری کا مژدہ پوری کلاس کو سنا دیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم سے پہلے بھی کچھ طالب علم جن میں توصیف احمد خان اور محمد علی چراغ شامل تھے اخبارات میں ہم سے بہتر اپرنٹس شپ مشاہرہ پر کام کر رہے تھے۔ نوائے وقت کا کنٹرول دوبارہ بیگم حمید نظامی صاحبہ نے سنبھال لیا تھا اور جناب مجید نظامی نوائے وقت کو خیر باد کہنے کے بعد روزنامہ ندائے ملت کا اجراء کر چکے تھے۔ یوں شعبہ صحافت کے طلبا و طالبات کی کثیر تعداد کو عملی صحافت میں قسمت آزمائی کے مواقع میسر آ گئے۔ شب بیداری کے باعث کلاس میں آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ تاہم دماغ سو رہا ہوتا تھا۔ اس کیفیت میں متعدد بار اساتذہ کرام کے تند و تیز ریمارکس کا سامنا بھی رہا۔ یہ محض ابتدائی ایام کی کیفیت تھی۔ آہستہ آہستہ ہمارے نوائے وقت میں قدم جمنا شروع ہو گئے۔ میں باقاعدگی سے

ٹھیلے والے نے ہماری طرف دیکھا اور کہنے لگا تم دونوں
یہ ساتھ والے اخبار سے ہو؟ کیونکہ اس اخبار سے جو بھی
یہاں آتا ہے وہ ایک پلیٹ کے ساتھ دو چمچ مانگتا ہے

Scanned with CamScanner

میری کتاب کا نام ''کاکولیات'' ہے، اس کے اب تک 30 مصدقہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں

''کیمپس ڈائری'' لکھتا تھا جس میں یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی تقریبات، تعلیمی مسائل اور دیگر امور کا تذکرہ شامل تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ شعبہ صحافت سے باہر بھی پذیرائی مل رہی ہے۔ جان پہچان کا دائرہ دیگر شعبہ جات میں وسیع ہونے کے باوجود ہماری ''جان'' شعبہ صحافت ہی میں تھی۔

اس وقت فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف متحدہ حزب اختلاف کی ملک گیر تحریک کامیاب ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی جگہ تازہ دم جنرل آغا محمد یحییٰ خان کسی رکاوٹ کے بغیر ایوان اقتدار میں داخل ہو گئے۔ پورے ملک میں امن وامان بحال ہو گیا اور وطن عزیز کے نئے سربراہ نے منصفانہ اور جماعتی انتخابات کا اعلان کر کے عوام کے دل جیت لیے۔ لیکن یہ کس کو معلوم تھا کہ شفاف ترین انتخابات کے نتائج ہی ملک کو دو لخت کر دیں گے۔ اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے درودیوار بھی ''ایشیا سرخ'' اور ''ایشیا سبز'' کے نعروں سے گونجتے تھے۔ کلاس رومز میں اسلام، سوشلزم اور نیشنل ازم کے حوالے سے بہت بحثیں ہوتی تھیں۔ شعبہ صحافت میں بھی یہ معرکہ زوروں پر تھا۔ انہی دنوں یونیورسٹی یونین کے انتخابات سر پر آ گئے۔ زبردست معرکہ برپا تھا۔ صدر کے لیے حافظ ادریس (اسلامی جمعیت طلبہ) اور لیفٹ الائنس کے حمایت یافتہ جہانگیر بدر (این ایس ایف/این ایس او وغیرہ) کے مابین سخت مقابلہ ہوا۔ حافظ صاحب کامیاب ہو گئے۔ نائب صدر سید تنویر عباس تابش اور جنرل سیکرٹری عبدالحفیظ خان منتخب ہوئے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے حامی امیدوار واضح برتری سے جیت گئے لیکن ہارنے والے امیدواروں نے دھاندلی کا الزام لگایا اور ہنگامے شروع ہو گئے۔ ہر طرف ''حق اور باطل'' کا ایک معرکہ برپا تھا۔ نوبت مارکٹائی، وائس چانسلر کی رہائش گاہ پر حملے اور پھر فوجی عدالت تک جا پہنچی۔ حافظ محمد ادریس اور جہانگیر بدر کے ووٹوں میں ایک سو کا فرق تھا جو بار بار گنتی کے باوجود برقرار رہا۔ بہرحال ہنگامے ختم نہ ہوئے۔ وائس چانسلر علامہ علاء الدین صدیقی وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے لاء کالج کے پرنسپل پروفیسر امتیاز علی شیخ کی سربراہی میں کمیٹی قائم کر دی۔ رات گئے وائس چانسلر ہاؤس میں چند طلباء نے ہنگامہ آرائی کی، پولیس آ گئی، گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ کیس ملٹری کورٹ کے سپرد کر دیا گیا۔ پولیس نے دونوں جانب کے سرکردہ طلبہ کو گرفتار کر لیا تھا۔ ملٹری کورٹ نے ایک ایک برس کی سزا سنا دی۔ چند بری بھی ہوئے ان میں منتخب جنرل سیکرٹری عبدالحفیظ خان اور میرے ہم جماعت اجمل ملک بھی شامل تھے۔ ملٹری کورٹ میں سماعت کے دوران وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی سمیت متعدد اساتذہ کرام اور طلبہ کو گواہی کے لیے طلب کیا گیا۔ ملٹری کورٹ کے سربراہ لیفٹیننٹ کرنل آفریدی تھے جو دوران سماعت ملزمان اور گواہوں سے نوک

Scanned with CamScanner

دار سوالات پوچھتے تھے۔ خاص طور پر ان کا یونیورسٹی کے حالات پر تبصرہ بہت عرصہ تک زیر بحث رہا کہ غریب والدین بچوں کو یہاں پڑھنے لکھنے کے لیے بھیجتے ہیں، ہتھکڑیاں لگا کر عدالتوں میں چکر کاٹنے کے لیے نہیں۔

موصوف نے وائس چانسلر سے بھی یونیورسٹی میں ہنگامہ آرائی، یونین سازی اور تعلیم کے دورانیہ کے بارے میں بھی سوالات کیے۔ شعبہ صحافت کے صدر ڈاکٹر عبد السلام خورشید اور مسکین علی حجازی صاحب بھی حاضری رجسٹر اٹھائے عدالت میں آئے اور یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ جب ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی اس وقت طالب علم کلاس رومز میں تھے۔ سزا یافتہ طالب علم کچھ عرصہ لاہور جیل میں رہے پھر انہیں مختلف جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ ابتلاء کے اس ناقابل فراموش دور میں پروفیسر وارث میر نے طالب علموں کو راہِ راست پر لانے کی بھرپور کوشش کی۔ یونین سازی کا سارا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا۔ چند روز بحث مباحثہ ہوا، اساتذہ کرام اور طلبہ و طالبات کی تمام تر توجہ دوبارہ پڑھائی پر مرکوز ہو گئی۔

ہمارے زمانہ طالب علمی میں پنجاب یونیورسٹی کے بوائز ہاسٹل کی تعداد کم تھی۔ لہذا کرائے کے چند گھروں میں عارضی انتظامات کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ماڈل ٹاؤن لاہور میں تھا۔ وارث میر صاحب اس عارضی ہاسٹل کے وارڈن بھی رہے۔ ماڈل ٹاؤن سے براستہ ''بے آباد'' گارڈن ٹاؤن سے پنجاب یونیورسٹی جاتے سائیکل سوار وارث میر کی نظر میں ہم تین چار پیدل طالب علم آتے تو وہ سائیکل سے اتر کر پیدل سفر شروع کر دیتے۔ شارٹ کٹ کے لئے ہم یونیورسٹی کے سرسبز کھیتوں میں داخل ہو جاتے۔ اس زمانے میں آہنی جنگلے نہیں لگے تھے۔ یوں وارث میر صاحب کی ہمراہی ہی میں ہماری اوپن کلاس ہو جاتی تھی۔ وارث میر صاحب کی عالمانہ فصاحت کے دوران ''یس سر'' اور جی سر کے ساتھ کھیت کی پگڈنڈی پر استادِ مکرم کی سائیکل کو سنبھالے رکھنا اہم مرحلہ ہوتا۔ سائیکل کا ہینڈل توصیف احمد خان (آج کل سینئر صحافی) کے پاس ہوتا اور پچھلا پہیہ کیریئر کی مدد سے میرے کنٹرول میں تھا۔ یوں ہم آدھ پون گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد یونیورسٹی پہنچ جاتے جہاں موجود چپڑاسی میر صاحب کی سائیکل کو احتیاط کے ساتھ پارک کر دیتا۔ اس زمانے میں صدر شعبہ ڈاکٹر عبد السلام خورشید بھی تھری پیس سوٹ پہن کر سائیکل چلاتے ہوئے یونیورسٹی آیا کرتے تھے۔

پروفیسر وارث میر ہماری کلاس کو لینگویج اینڈ لٹریچر (زبان اور ادب) پڑھاتے تھے۔ ان کے لیکچر دلچسپ، معلوماتی اور موضوع سے ہم آہنگ ہوتے تھے۔ بھرپور تیاری کے بعد کلاس میں داخل ہوتے ہی چھا جاتے تھے۔ انداز خطیبانہ تھا۔ لیکن ہمارے سوالات کے جواب مشفقانہ لہجے میں عنایت فرماتے۔ کلاس میں طالبات کی اکثریت تھی اور آغاز

''کاکولیات'' چھپنے کے بعد اس پر اعتراضات بھی ہوئے اور اجازت نامے کی طلبی تک بات جا پہنچی

Scanned with CamScanner

شانے پر ایک پھول آویزاں تھا لیکن

''رگڑے'' کے لحاظ سے کیڈٹ لائف

کا دور پھر لوٹ آیا تھا

میں ابتدائی دو قطاریں ان کے لیے مخصوص ہوگئیں۔ لڑکے تیسری قطار میں باادب انداز میں براجمان ہوتے تھے۔ میر صاحب لیکچر کے دوران زیادہ تر تیسری قطار ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے۔ لیکن چند ہفتوں کے بعد جب قطاریں تتر بتر ہوگئیں تو میر صاحب کی نگاہ میں سب یکساں ہوگئے۔ جلد ہی میر صاحب کا ہماری کلاس سے دوطرفہ ابلاغ استوار ہو گیا تو زیادہ کھل گئے۔

پروفیسر وارث میر بنیادی طور پر ایک غیر نصابی ٹیچر تھے۔ انہیں احساس تھا کہ طالب علموں کے نزدیک سلیبس کی اہمیت صرف پینتالیس منٹ کے پیریڈ تک محدود ہے لیکن نصاب میں سے ابھرنے والے بظاہر غیر نصابی سوالات کی مدت حیات کا تعین مشکل ہے۔ انہوں نے بھری کلاس میں ایسے موضوعات پر بھی اظہار رائے کی جرات کی جنہیں بعض اساتذہ حفظ ماتقدم کے طور پر نظر انداز کر جاتے تھے۔ پروفیسر وارث میر صاحب کا آبائی تعلق شہر اقبالؒ سیالکوٹ سے تھا لیکن انہوں نے اس تعلق پر کبھی فخر یا تاسف نہیں کیا۔ دراصل انہیں اقبالؒ کے شہر کی نسبت اقبالؒ کی فکر سے زیادہ عقیدت اور لگاؤ تھا۔ میرے خیال سے وارث میر صاحب نظریاتی لحاظ سے سچے اور بھرپور پاکستانی تھے۔ انہوں نے کلاس روم یا غیر نصابی اجتماعات میں طالب علموں کے سامنے کسی ''ازم'' کا پرچار نہ کیا تاہم سیاسی، معاشی اور سماجی نظریات پر کھل کر گفتگو فرمایا کرتے۔

سقوط ڈھاکہ کے سانحہ نے ہر پاکستانی کی طرح انہیں بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس سانحہ کے بعد جمہوری تماشے اور مارشل لاء کے جبس میں پرورش پانے والی مافوق الفطرت سیاسی مخلوق نے انہیں زک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ میں 1973ء سے پاک فوج کے محکمہ تعلقات عامہ آئی ایس پی آر سے منسلک تھا۔ 1981ء کے اوائل میں میری تعیناتی لاہور ہوگئی اور یوں استاد محترم وارث میر صاحب سے ملاقات کے مواقع زیادہ ملنے لگے۔ ایک روز میں ڈیوس روڈ پر واقع ایک اخبار کے دفتر میں کسی خبر یا تصویر وغیرہ کی اشاعت کے لئے نیوز روم میں بیٹھا تھا کہ شعبہ صحافت کے ایک اور سابق طالب علم اظہر زمان بھی آ گئے۔ یہ اس وقت لاہور میں امریکی اطلاعاتی مرکز (یو ایس آئی ایس) میں تعلقات عامہ کے افسر تھے۔ ہم دونوں اپنے فرائض سے فارغ ہو کر سیڑھیاں اتر رہے تھے کہ پروفیسر وارث میر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ حسب معمول گرم جوشی سے پیش آئے۔ حال احوال پوچھتے ہوئے اخبار کے دفتر سے باہر آئے تو اظہر زمان نے امریکی اطلاعاتی مرکز کی گاڑی میں یونیورسٹی کیمپس پہنچانے کی پیش کش کی۔ میرے پاس آرمی کی جیپ تھی۔ میں نے بھی مودبانہ انداز میں اصرار کیا۔ وارث میر صاحب نے ہم دونوں کی جانب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور فرمانے لگے کہ تم دونوں نے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ کچھ توقف کے بعد ہم سے ہاتھ ملایا اور

Scanned with CamScanner

تیزی سے ایک آٹو رکشے کی طرف بڑھے اور اس میں سوار ہو کر یونیورسٹی روانہ ہو گئے۔ ہم دونوں سکتے میں آ گئے اور انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

میری پڑھائی اور نوکری کی سمت ایک تھی۔ کبھی کبھار رپورٹنگ کی ڈیوٹی بھی مل جاتی تو اندازہ ہوتا تھا کہ فیلڈ میں نیوز رپورٹر کی کس قدر اہمیت ہے۔ خاص طور سے 1970ء کے قومی انتخابات میں لاہور کے مختلف حلقوں کے بارے میں خصوصی رپورٹس کی تیاری کے لیے سینئر رپورٹرز کے ہم رکاب رہے۔ یہ میرا ایک انتہائی مفید تجربہ تھا۔ ایک روز ہم چند دوستوں نے مشرقی پاکستان کی ''غیر سرکاری سیر'' کا پروگرام بنایا۔ بنیادی وجہ حالات کا بچشم خود جائزہ لینا تھا۔ یہ چھ رکنی وفد تھا جس میں شعبہ صحافت کے طالب علم ارشد علوی، اجمل ملک، مقبول احمد، فاروق خان، فلسطینی طالب علم سلیمان اور میں شامل تھے۔ ہم چھ طالب علموں نے پہلے زادراہ جمع کیا جس میں سب سے زیادہ حصہ لاہور کی ایک اہم سماجی شخصیت رانا نذر الرحمٰن کا تھا۔ انہوں نے ہماری کاوش کو بہت سراہتے ہوئے ڈھاکہ میں بھی اپنی کمپنی کے ذریعے رہائش کا انتظام کر دیا۔ مشرقی پاکستان کا یہ دورہ بیک وقت معلوماتی اور تفریحی تھا۔ ہم نے ڈھاکہ سے کاکس بازار بذریعہ سڑک سفر کیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں طلبہ و طالبات کی جانب سے دیئے گئے ایک استقبالیہ میں بھی شریک ہوئے۔ دوستانہ ماحول میں تلخ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ ایک موقع پر چند طلبا نے ''بنگلہ بنگلہ'' کے نعرے لگائے۔ ہم نے اردو رسم الخط میں بنگلہ زبان کے چند دل موہ لینے والے جملے لکھ رکھے تھے، یہ جملے جونہی ہال میں گونجے تو سب نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ قیام کے دوران رات گئے بازاروں میں گھومنا معمول تھا۔ ابھی مجیب، بھٹو تناؤ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ مارشل لاء نافذ تھا لیکن سیاسی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ اخبارات من پسند صحافت کر رہے تھے۔ جمہوریت کی بحالی کا نعرہ سیاست اور صحافت میں یکساں موجزن تھا۔ ہم تقریباً دس روز مشرقی پاکستان میں رہے، تب ذہن میں دور دور تک یہ خوف اور شائبہ تک نہیں تھا کہ یہ سرسبز خطہ ایک برس کے بعد حتمی جدائی کے سفر پر گامزن ہو جائے گا۔ واپسی کے بعد میں نے نوائے وقت اور ہفت روزہ چٹان میں روداد سفر تحریر کی۔ ایک مضمون میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں ''بنگلہ دیش'' کے نعرے کا ذکر بھی کیا۔ اس کے علاوہ کرنافلی کے ریسٹ ہاؤس کے قریب واقع سکول کے بنگالی بچوں کی مدھر آواز میں علی الصبح پاک سرزمین شاد باد کی گونج کو بھی بیان کیا گیا۔

مشرقی پاکستان کے کامیاب دورے کی پوری یونیورسٹی میں دھوم تھی۔ اساتذہ یا طلبہ و طالبات میں سے کوئی علیحدگی کے خدشات کا اظہار کرتا تو ہم اپنے دورے کی سحر انگیز روداد بیان کرنا شروع کر دیتے تھے، شاید حالات کو ہم سرسری انداز میں دیکھ رہے تھے۔ 1970ء کے قومی انتخابات سر پر تھے۔ لاہور

انہوں نے پوری کلاس کو یہ مژدہ سنایا کہ ''تمہاری صفوں میں ایک کالی بھیڑ موجود ہے جس نے آج سارے تو پچی افسروں کی ناک کٹوا دی ہے، یہ آئی ایس پی آر میں پی آر او بھرتی ہونا چاہتا ہے

Scanned with CamScanner

بچہ پگڈنڈی کے کنارے کھڑا ہاتھ ماتھے پر اٹکائے شاید جیپ کے نظروں سے اوجھل ہونے کا انتظار کر رہا تھا، یہ سلیوٹ میری نگاہوں میں جم گیا، مجھے محسوس ہوا کہ سولہ دسمبر 71ء کی ہزیمت عارضی ہے

میں متعدد معرکہ ہائے حق و باطل برپا تھے۔ پیپلز پارٹی کے بانی اور چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے جلسے جلوس مغربی پاکستان میں پرہجوم ہوتے تاہم انہوں نے مشرقی پاکستان کو نظر انداز کئے رکھا۔ یہی حال عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن کا تھا جو مشرقی پاکستان کے طول و عرض میں اپنی سیاسی حاکمیت قائم کر چکے تھے۔ انتخابات میں ایک تیسرا فریق اسلام پسند جماعتیں تھیں جن میں سرفہرست جماعت اسلامی تھی جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں انتخابی مہم جاری رکھے ہوئے تھی۔ انہوں نے ''شوکت اسلام'' کے بینر تلے زبردست جلسے جلوس کئے اور ریلیاں نکالیں۔ انتخابات مکمل ہوئے تو وطن عزیز کو ایک تشویشناک مینڈیٹ کا سامنا تھا۔ سیاسی لحاظ سے ملک واضح طور پر دو اکائیوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل آغا محمد یحییٰ خان شفاف انتخابات کا کریڈٹ لے رہے تھے، بعض سیاسی دانشور صورتحال کو ملک کے مستقبل کے لئے ''منفی'' قرار دے رہے تھے۔ جنرل یحییٰ خان نے عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن کو مستقبل کا وزیراعظم قرار دے دیا تھا۔ یہ صورتحال سیاسی لحاظ سے پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے لئے ناقابل قبول تھی۔

انہوں نے پہلے دبے لفظوں اپنے خدشات کا اظہار کیا اور کچھ عرصے بعد سخت موقف اپنایا جس کا مقصد قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس سے قبل بعض سیاسی معاملات پر اکثریتی پارٹی عوامی لیگ سے ''بھاؤ تاؤ'' کرنا تھا۔ مزید برآں بھٹو صاحب نے پنجاب کے شہریوں کو خوش کرنے کے لئے بھارت مخالف بیانات دینے شروع کر دیئے تھے۔ اس دوران بھٹو صاحب ڈھاکہ بھی گئے جہاں انہوں نے پارٹی کے سینئر اراکین کے ہمراہ عوامی لیگ کے وفد سے مستقبل کے سیاسی ڈھانچے پر بات چیت کی، وفد کی قیادت شیخ مجیب الرحمٰن کر رہے تھے۔ یہ مذاکرات 24 جنوری 1971ء سے 29 جنوری 1971ء تک جاری رہے۔ 30 جنوری 71ء کو لاہور ایئرپورٹ پر انڈین ایئر لائنز کا مسافر بردار طیارہ لینڈ کر گیا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ اسے کشمیری مجاہدین اشرف اور ہاشم نے اغوا کیا ہے اور مطالبات تسلیم ہونے تک مسافر رہا نہیں ہوں گے۔ یہ غیر معمولی صورتحال تھی۔ بھارتی حکومت سیخ پا تھی، لاہور کے عوام کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین بھٹو صاحب بھی کشمیری ہائی جیکرز سے ملاقات کے لئے ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ انہوں نے نیک خواہشات کا اظہار کیا، بھٹو صاحب کی ہائی جیکرز سے ملاقات نے ان کی مقبولیت میں زبردست اضافہ کر دیا۔ اخبارات کے فرنٹ صفحات تصویروں سے بھر گئے۔ دوسری جانب عوامی لیگ کے شیخ مجیب الرحمٰن نے اس واقعے پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے مسافروں کی رہائی کی اپیل کی۔ ایئرپورٹ پر صورتحال گھمبیر تھی۔ سیکورٹی ادارے بھی الرٹ تھے

Scanned with CamScanner

تاہم حکومت کسی براہ راست ایکشن کے حق میں نہ تھی۔ ہاشم اور اشرف لاہوریوں کی آنکھ کا تارا بن گئے تھے۔ میں بھی اخبار کی جانب سے رپورٹنگ کی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ ہائی جیکروں نے پہلے مسافروں کو خیر سگالی کے طور پر رہا کر دیا۔ یہ اقدام انسانی بنیادوں پر اٹھایا گیا تھا کیونکہ مسافروں میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ بعدازاں اس مسافر بردار جہاز کو ہائی جیکروں نے آگ لگا کر تباہ کر دیا۔ بھارتی حکومت نے اس کارروائی کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مسافر بردار جہازوں کو بھارتی فضائی حدود کے استعمال سے روک دیا۔ یوں پاکستانی مسافر بردار جہاز سری لنکا کے راستے ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) جاتے تھے۔ ہائی جیکرز ہاشم اور اشرف لاہور ایئرپورٹ پر آپریشن کے بعد ایک کھلے ٹرک پر سوار ہوئے اور لاہور کی شاہراہوں پر لاکھوں کے جلوس میں ہاتھ ہلا ہلا کر عوامی جذبات کا جواب دے رہے تھے۔ لاہور میں عجب کیفیت تھی۔ انہیں میکلوڈ روڈ کے ایک ہوٹل میں لے جایا گیا جہاں مقامی کشمیری قیادت نے انہیں خوش آمدید کہا۔ یہ کشمیری رہنما مقبول بٹ کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے پہلی پریس کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ کچھ عرصہ بعد ہاشم، اشرف اور مقبول بٹ کے بارے میں متضاد خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ کچھ سیاسی حلقے اسے بھارتی انٹیلی جنس کی کارروائی قرار دے رہے تھے تاکہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین فضائی رابطے کو پرخطر اور طویل بنا دیا جائے۔

بھارت اپنے مشن میں کامیاب دکھائی دیا۔ ہم 1970ء کے انتخابات کے بعد سہانے سیاسی خواب دیکھ رہے تھے لیکن دشمن 71ء کے آغاز ہی سے 1965ء کی جنگ میں ناکامی کا بدلہ لینے کے لئے طویل منصوبہ بندی کر چکا تھا۔ 70ء کے انتخابات کے نتائج کو دشمن نے اپنے حق میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ بدقسمتی سے دونوں بڑے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو دو قبائلی سرداروں کی مانند آمنے سامنے آ گئے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن پر لاکھ الزام لگائے جاتے ہیں لیکن سیاسی حقائق ان کے حق میں تھے۔ عوامی لیگ پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی اسے حکومت بنانے کا مکمل اختیار اور حق تھا۔ بھٹو صاحب عوامی لیگ سے نصف سے بھی کم نشستیں حاصل کرنے کے باوجود بنگالی قیادت کو للکار رہے تھے۔ یوں وطن عزیز کو سیاسی آتش فشاں کا سامنا تھا۔ مارشل لاء حکومت آزادانہ اور غیر جانبدارانہ الیکشن کرانے پر پھولے نہیں سما رہی تھی لیکن انتخابات کے نتائج پر عمل درآمد کروانے کے معاملے میں فیصلہ کن کردار ادا نہ کر سکی۔ صدر جنرل یحییٰ خان نے متعدد بار شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقاتیں کیں لیکن انہیں ''ربط باہمی'' پر قائل نہیں کر سکے۔ مشرقی پاکستان روز بروز ''آگ بگولہ'' ہو رہا تھا۔ دشمن کے سہولت کار، آلہ کار اور کئی مقامات پر براہ راست بھارتی اہلکار بھیس بدل کر

میں خاصا پریشان تھا۔ پوسٹ آؤٹ ہونے والے
کمانڈنگ افسر نے خاصی ''گوشمالی'' کر دی تھی
بس یونٹ سے ٹھڈے مار کر نکالنے کی کسر باقی رہ گئی تھی

Scanned with CamScanner

میرا مضمون ''سلیوٹ'' کے عنوان سے شائع ہوا، سیکنڈ لیفٹیننٹ کے رینک کے ساتھ یہ میرا پہلا اور آخری مضمون ہے جو ہلال میں شائع ہوا، لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین نے پچاس روپے انعام کے ساتھ یونٹ کے اجتماع میں پڑھنے کا حکم بھی صادر کیا

مشرقی پاکستان داخل ہو چکے تھے۔ ان کو امن وامان کے مسائل بڑھانے کی ڈیوٹی سونپی گئی تھی تاکہ فوجی دستے اندرونی سلامتی کی ڈیوٹی پر تعینات کئے جائیں۔ صدر یحییٰ خان نے صورتحال کا درست ادراک کئے بغیر ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا مجوزہ اجلاس ملتوی کر دیا۔ اس سے قبل بھٹو نے مغربی پاکستان کے شہروں میں بڑے جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے ڈھاکہ اجلاس میں شرکت کرنے والوں کو جارحانہ انداز میں دھمکیاں دیں۔ پیپلز پارٹی کی جانب سے احمد رضا خان قصوری واحد ایم این اے تھے جنہوں نے بھٹو صاحب کے اس فیصلے کی کھلم کھلا مخالفت کی اور اسے ملک دشمنی کے مترادف قرار دیا۔ احمد رضا قصوری کے اس رویے کے باعث ان کی بھٹو صاحب سے ذاتی کشمکش کا آغاز بھی ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں احمد رضا خان قصوری کے مطابق ان کے والد پر لاہور میں آتشیں اسلحہ سے حملہ کیا گیا۔ جس میں نواب محمد احمد خان جانبر نہ ہو سکے۔ احمد رضا قصوری نے قتل کی ایف آئی آر میں بھٹو صاحب کو مرکزی ملزم نامزد کر دیا۔ بعدازاں جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت کے دوران اس ایف آئی آر کی بنیاد پر بھٹو صاحب کو قتل کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں سزائے موت ہو گئی۔ ہماری تاریخ کے بعض واقعات اپنے دامن میں عجیب پس منظر کے حامل ہیں۔ مشرقی پاکستان میں حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ دونوں بڑی سیاسی جماعتیں انتخابات میں واضح کامیابی کے باوجود ابھی تک پری الیکشن موڈ میں تھیں۔ قائدین کے اشتعال انگیز بیانات سے کشیدگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ مارچ 71ء میں قومی اسمبلی کا مجوزہ اجلاس ملتوی ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کے شہریوں کو یقین ہو گیا کہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے اقدامات سے پاک فوج کا وقار اور کریڈیبلٹی شدید متاثر ہوئے۔ بھٹو صاحب اپنے ہدف یعنی ہر قیمت پر اقتدار کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے، تاہم پاک افواج کو بھٹو صاحب کی ''جیت'' کا راستہ ہموار کرنے کے لئے بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ 1971ء میں سال بھر کے واقعات اس حقیقت کے غماز ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کی باہمی کشمکش نے مشرقی پاکستان میں قیام پذیر شہریوں اور پاک افواج کو شدید نقصان پہنچایا۔ مشرقی پاکستان میں لاکھوں بنگالی دربدر ہوئے۔ آپریشن ''سرچ لائٹ'' کے باعث بھارت کے سرحدی علاقے میں پناہ گزین ہو گئے۔ بھارت پہلے ہی سے تیار تھا۔ مکتی باہنی کے نام سے دستے تیار کئے گئے جنہوں نے پاکستان آرمی کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں میں حصہ لیا۔ مارچ 71 کے بعد بھی جنرل آغا محمد یحییٰ خان اور اس زمانے کی ملٹری ہائی کمان کو صورتحال کا صحیح ادراک نہیں ہو سکا تھا۔ انہوں نے اقتدار عوامی لیگ کے حوالے کرنے کے بجائے بھٹو صاحب کے ایجنڈے کو پروان چڑھانے کے

Scanned with CamScanner

لیے اپنے ادارے کی عزت، نیک نامی اور شہرت داؤ پر لگادی۔ یہ تاریخی حقائق ہیں۔

بدقسمتی سے 71ء کے سانحہ کے بعد بھی بھٹو، ملٹری الائنس برقرار رہا اور مغربی پاکستان کو پاکستان تصور کرتے ہوئے اقتدار بھٹو صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کار خیر میں لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اور پاک فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل رحیم خان پیش پیش تھے۔ سیاست کے عجب انداز ہیں کہ بھٹو صاحب نے اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد سب سے پہلے لیفٹیننٹ گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان کو غیر تقریبی انداز میں رخصت کیا۔ مشرقی پاکستان میں غیر یقینی صورتحال کی طوالت میں وہاں پر تعینات لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان کی حکمت عملی کو بھی کافی عمل دخل رہا۔ سانحہ ڈھاکہ کے بعد یہ بات زبان زدِ عام تھی کہ جنرل یحییٰ خان کو مشرقی پاکستان میں جب جنرل ٹکا خان کی ضرورت تھی تب لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان کو بھیج دیا۔ موصوف مزاجاً دانش ور اور عملاً صلح جو قسم کی شخصیت تھے۔ سنا ہے کہ انہیں چار پانچ زبانوں پر عبور تھا۔ کتابوں کے دلدادہ تھے۔ بنگالی زبان بھی جلد سیکھ لی تاکہ شیخ مجیب الرحمٰن اور دیگر بنگالی رہنماؤں سے گفتگو میں آسانی رہے۔ بدقسمتی سے جب صاحبزادہ یعقوب علی خان کو بنگالی زبان پر عبور حاصل ہوا تب بنگالی عوام نے ان کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں ''موجود'' بعض بھارتی فوجی افسروں نے بعد ازاں اعتراف کیا کہ 1970ء کے انتخابات کے دوران ہی بھارت نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے سیاسی اور عسکری اقدامات شروع کر دیئے تھے۔ بدقسمتی سے اسلام آباد تمام تر معلومات کے باوجود مناسب جوابی اقدامات سے گریزاں رہا۔ محض آرمی آپریشن سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ مشرقی پاکستان میں متحدہ پاکستان کے حامی عناصر میں زیادہ تر جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور نظام اسلام پارٹی سمیت دیگر ''اسلام پسند'' تنظیموں کے اراکین شامل تھے۔ ان کے علاوہ غیر بنگالی افراد کی کثیر تعداد شامل تھی۔ متحدہ پاکستان کے حامیوں پر بھارت نواز عناصر نے ظلم و تشدد کی انتہاء کر دی۔ ان میں سے کئی آج بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ 71ء کے واقعات کو بنیاد بنا کر عوامی لیگ کی ''بدلہ پالیسی'' کے باعث آج تک پھانسیاں جاری ہیں۔ اردو بولنے والے بھی تختہ مشق بنے۔ یہ زیادہ تر غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ بہار سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں منتقل ہو گئے تھے۔ انہیں بدترین قسم کے سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ متحدہ پاکستان کی محبت میں انہوں نے متعدد بار ہجرت اور موت کو گلے لگایا۔ آج بھی ڈھاکہ کے قرب و جوار میں بہاری کیمپ کے مقیم اسلام آباد کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ آنے والی نسلوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور بنگلہ دیش کو ہی اپنا وطن سمجھ کر گھل مل گئے ہیں۔

صدیق سالک اپنے ہمراہ سقوط ڈھاکہ اور بھارتی قید کا آنکھوں دیکھا حال لائے تھے جسے انہوں نے پھر ''ہمہ یاراں دوزخ''، ''وٹنس ٹو سرنڈر'' اور ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' جیسی کتابوں میں قلمبند کیا

Scanned with CamScanner

لنچ ٹیبل پر میجر جنرل محمد ضیاء الحق بے تکلفانہ گفتگو کے باعث سب کا دل موہ لیتے تھے

مشرقی پاکستان میں جاری جنگ کا ایک باب 16 دسمبر 1971ء کو اختتام پذیر ہوا۔ پاک افواج کی ایسٹرن کمانڈ نے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبد اللہ خان نیازی کی قیادت میں بھارت اور بنگلہ دیش (مکتی باہنی) کی مشترکہ کمان کے حکم پر ہتھیار رکھ دیئے کیونکہ مزید جنگ جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بھارت واضح برتری کے ساتھ تمام محاذوں پر موجود تھا۔ پاکستانی افواج کے لڑاکا دستے 35 ہزار کے لگ بھگ تھے۔ اس کے علاوہ سول آرمڈ فورسز اور پولیس اور رضا کار وغیرہ بھی تھے۔ جنگی قیدیوں کی تعداد 90 ہزار تھی جنہیں مرحلہ وار بھارت منتقل کر دیا گیا۔

جنگ ستمبر 65ء کے دوران عوام کو خوش کرنے کے لئے ایسی کہانیاں عام کر دی گئی تھیں کہ جن میں بیان کیا جاتا تھا کہ فلاں پل پر جب دشمن کے جہاز بمباری کر رہے تھے تو ان کے پائلٹس نے دیکھا کہ سبز چوغے والے بابے بم کیچ کر کے ادھر ادھر پھینک رہے تھے۔ ایک روز سینکڑوں شہری ایک ہسپتال میں بھارتی فوج کے ان گرفتار زخمی فوجیوں کو دیکھنے کے لیے امڈ آئے جن کے بارے میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ ان کے جسموں پر تلوار سے زخم آئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹروں نے بڑی مشکل سے لوگوں کو قائل کیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یوں ہم جناتی کہانیوں کا من وسلویٰ نوش جاں کر کے میٹھی نیند سو رہے تھے کہ 1971ء سر پر آن پہنچا۔ سیاسی اور ابلاغی میدان میں ہماری تیاری صفر تھی۔ لہٰذا دنیا بھر میں ہماری رسوائی ہوئی اور سبق یہ ملا کہ سیاسی، عسکری، معاشی اور ابلاغی حقائق سے آنکھیں بند کر کے فاتحانہ پیش قدمی کی امیدیں کرنا خودفریبی کے مترادف ہے۔

میں 1971ء کے آغاز ہی میں پنجاب یونیورسٹی سے فارغ ہو چکا تھا اور نوائے وقت سے ''برطرف''۔ دراصل جنرل یحییٰ خان کے دور میں صحافیوں کی ایک ملک گیر ہڑتال ہوئی تھی اور مطالبات اور مسائل وہی قدیمی جو آج تک چلے آ رہے ہیں۔ نوائے وقت میں ہم محترم سید ظہور عالم شہید کے ''پیر و کار'' تھے۔ وہ عملی صحافت میں ہمارے لیے استاد کے درجے پر فائز تھے۔ ہڑتال کے دوران اخبار کی انتظامیہ نے متعدد سرگرم ورکرز کو نکال باہر کیا جن میں اجمل ملک اور میں (صولت رضا) سرفہرست تھے۔ صحافیوں کی برطرفی کے بعد لاہور میں صحافیوں کے دو اخبار جاری کئے گئے۔ ایک روزنامہ ''جاوداں'' تھا جسے ظہور عالم شہید اور ان کے قریبی رفیق جناب بشیر احمد ارشد کی سربراہی حاصل تھی۔ میں اور اجمل لک روزنامہ جاوداں میں آ گئے۔ دوسرا اخبار روزنامہ آزاد تھا جس کے کرتا دھرتا محترم عبد اللہ ملک، جناب حمید اختر، نذیر ناجی صاحب اور عباس اطہر صاحب تھے۔ ابھی مشرقی پاکستان الگ نہیں ہوا تھا اور اخبارات بھی متحدہ پاکستان ہی کی صحافت میں مصروف تھے۔ معاشی لحاظ

سے یہ بڑا کڑا وقت تھا۔ ہم زیادہ تر پیدل چلتے اور روزنامہ جاوداں کو کامیاب کرنے کے لئے رپورٹر، سب ایڈیٹر اور کبھی کبھار ضمیمہ نکلتا تو ہاکر کے فرائض بھی انجام دینا شروع کر دیتے تھے۔ ایک جانب اساتذہ سے عقیدت اور احترام کا رشتہ تھا تو دوسری حقیقت خالی جیب تھی۔ ایک روز میرے والد صاحب نے خوب لتاڑا۔ پروانہ ملازمت پر تنخواہ چار سو پچیس روپے درج تھی لیکن کئی ماہ سے محض ایک ماہ یا پندرہ دن کی تنخواہ کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ دوست احباب سے ادھار لے کر کام چل رہا تھا۔ والد صاحب کو تشویش تھی کہ میں تنخواہ کی رقم اجاڑ رہا ہوں۔ کیونکہ 71-1970ء میں یہ معمولی پیسے نہیں تھے۔ ''رضی کے ابا'' یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے کہ کرہ ارض پر کوئی نوکری ایسی بھی ہوسکتی ہے جہاں صبح سے شام تک کام کرنے کے باوجود تنخواہ نہ ملتی ہو۔ بہرحال ایک روز رات گئے اجمل ملک اور میں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے میکلوڈ روڈ اور ایبٹ روڈ کے سنگم پر واقع ایک دال چاول کے ٹھیلے پر گئے اور ایک پلیٹ کا آرڈر دے دیا۔ ساتھ دو چمچ بھی طلب کئے۔ ٹھیلے والے نے ہماری طرف دیکھا اور کہنے لگا تم دونوں یہ ساتھ والے اخبار سے ہو؟ کیونکہ اس اخبار سے جو بھی یہاں آتا ہے وہ ایک پلیٹ کے ساتھ دو چمچ مانگتا ہے۔ شاید ایک روپے کی پلیٹ تھی۔ ہم دونوں نے خاموشی سے چاول کھائے اور دوبارہ اخبار کا رخ کیا۔ رہائش کے لئے سجاد میر کا کمرہ تھا جہاں ہم زمین پر بستر لگا کر کمر سیدھی کرتے۔ خوش قسمتی سے میر صاحب کی سخاوت کے باعث ہفتے میں دو تین مرتبہ گوالمنڈی کا ناشتہ یا رات گئے مچھلی کباب تناول کرنے کے مواقع مل جاتے تھے۔

اکتوبر 1971ء میں وطن عزیز جنگی ماحول سے گزر رہا تھا۔ مشرقی پاکستان سے ''خوش گوار'' اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ شورش زدہ علاقوں پر بظاہر کنٹرول ہو چکا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان کے بعد بھرپور آپریشن کے لئے لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو ایسٹرن کمانڈ کی کمان دی گئی تھی۔ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود حالات پر عسکری برتری حاصل کر لی تھی۔ لیکن بھارتی اثر و رسوخ کا مکمل قلع قمع نہ کیا جا سکا کیونکہ مقامی آبادی کی اکثریت متحدہ پاکستان کے ساتھ اپنا ناطہ توڑ چکی تھی۔ جنرل ٹکا خان کے بعد جنرل نیازی کو کمان دی گئی، انہوں نے بھی جاری پلان ہی پر عمل درآمد کو فوقیت دی۔ بات جنگی ماحول کی ہو رہی تھی۔ مغربی پاکستان بالخصوص لاہور میں فاتحانہ کیفیت تھی، ظاہر ہے کہ خبریں یکطرفہ انداز میں نمایاں کی جا رہی تھیں۔ ہم تین چار دوستوں نے آرمی میں کمیشن کے فارم داخل کر دیئے۔ اجمل ملک شامل نہیں تھے۔ انہوں نے صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) کے صوبائی محکمہ اطلاعات میں ملازمت کے لئے درخواست دائر کی تھی۔ کمیشن کے ابتدائی امتحانات میڈیکل وغیرہ لاہور ہی میں ہوئے۔ آخر

جنرل محمد ضیاء الحق اپنے مخاطب کو
ہمیشہ نام کے ساتھ ''صاحب'' کہہ کر
گفتگو کا آغاز کرتے

Scanned with CamScanner

خیال تھا کہ بھٹو کا کردار مجرمانہ ہے، انہوں نے مارچ 1971ء میں قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس کا بائیکاٹ کر کے مشرقی پاکستان میں بھارتی ایجنٹوں اور علیحدگی پسندوں کو سیاسی لحاظ سے ایک بنیاد فراہم کی تھی

کار دسمبر 1971ء کے پہلے ہفتے میں آئی ایس ایس بی کوہاٹ کی کال آ گئی۔ آئی ایس ایس بی کوہاٹ میں چار روز قیام رہا متعدد نوعیت کے فنی، نفسیاتی اور کسرتی امتحانات کا سامنا رہا۔ فائنل انٹرویو میں بورڈ کے سربراہ نے پوچھا کہ ایم اے جنرل ازم اور ورکنگ جرنلسٹ فوج میں کیا کرے گا؟ میں نے گفتگو کے دوران محسوس کیا کہ میرے روایتی جوابات سے اراکین مطمئن نہیں ہیں اور بار بار اصرار کر رہے تھے کہ اگر فوج میں آنا ہی تھا تو زیادہ سے زیادہ گریجوایشن کے بعد درخواست دے سکتے تھے۔ یہ ایم اے جرنل ازم تو ''مس فٹ'' ہوگا۔ انٹرویو ختم ہونے کے قریب تھا کہ میں نے واضح کہا کہ اگر اخبار کی ملازمت میں باقاعدہ تنخواہ ملتی رہتی تو میں کبھی کمیشن کے لیے اپلائی نہ کرتا۔ میرا موقف سنتے ہی اراکین نے مزید سوال داغ دیئے۔ میرے جوابات ان کے لیے حیران کن اور ناقابل فہم تھے۔ بہرحال ''تھینک یو'' کی آواز آئی اور میں ناامیدی کی کیفیت سے باہر آ گیا۔ اس زمانے میں آئی ایس ایس بی کے رزلٹ سے کوہاٹ ہی میں آگاہ کر دیا جاتا تھا۔ فائنل انٹرویو گیارہ بجے صبح ہوا اور نتائج کا اعلان چھ بجے شام کیا گیا۔ ہال میں تقریباً دو سو امیدوار تھے۔ صرف کامیاب امیدواروں کے نمبر اور نام پکارے جا رہے تھے۔ ہال میں میرا نمبر اور نام گونجا تو یقین نہیں آیا۔ کسی نے کمر پر زور سے ہاتھ مارا تو میرے اوسان بحال ہوئے اور ڈائس پر ایستادہ افسر سے کامیابی کا لیٹر وصول کیا۔ اگلے روز گھر ماڈل ٹاؤن لاہور واپسی ہوئی تو ہر طرف فضا سوگوار تھی۔ سقوط ڈھاکہ رونما ہو چکا تھا۔ 16 دسمبر 71ء ہماری قومی اور ملی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا' مجھے کسی نے نہ مبارکباد دی اور نہ شاباش۔ ہر طرف اداسی، غم اور حسرت و یاس کا بسیرا تھا۔ میرے والدین کی مشرقی پاکستان سے بے پناہ خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ والدہ کے آنسو رکنے میں نہ آ رہے تھے۔ ایسے عالم میں گھر والوں نے مجھے پی ایم اے کاکول روانہ کیا۔

لاہور ریلوے سٹیشن پر والد گرامی اور اکلوتے ماموں سعید الحسن نے الوداع کہا۔ ٹرین علی الصبح حویلیاں ریلوے سٹیشن پر پہنچی۔ پی ایم اے کی بسیں موجود تھیں۔ سامان سر پر اٹھایا اور بس کی چھت پر مل جل کر ترتیب دیا۔ یہ ''ابتدائے عشق لیفٹینی'' تھا۔ آگے بے شمار اندوہناک امتحانات منتظر تھے۔ پاکستان بھارت کی جنگ اور سقوط ڈھاکہ کے باعث دو سالہ تربیتی کورس کا دورانیہ کم کر کے دس مہینے کر دیا گیا تھا۔ اب دن رات ٹریننگ پروگرامز جاری تھے، پی ایم اے میں کیڈٹ کے شب و روز کو میں نے 1975ء میں کتابی صورت میں شائع کیا، اس کتاب کا نام ''کاکولیات'' ہے، اس کے اب تک 30 مصدقہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ غیر مصدقہ ایڈیشنوں کی تعداد کے بارے میں کچھ لکھنا ممکن نہیں۔ کاکولیات کی اشاعت کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ دراصل یہ ایک کیڈٹ کے تربیتی دور کے

بارے میں پہلی کتاب تھی جو منظر عام پر آئی۔ اشاعت کے بعد اس پر اعتراضات بھی ہوئے اور اجازت نامے کی طلبی تک بات جا پہنچی۔ کاکول میں کیڈٹ لائف کے بارے میں میرا پہلا مضمون پاک فوج کے ترجمان ماہنامہ ''ہلال'' (اُس وقت ہفت روزہ) میں ''روٹ مارچ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ہلال کے ایڈیٹر اکرام قمر صاحب نے باوجود میری کوشش کے مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے نہیں دیا۔ ایک کے بعد دوسری قسط اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ یوں کاکولیات کا تقریباً متن ہلال میں شائع شدہ تھا لہٰذا اجازت نامے کی پوچھ گچھ تکنیکی بنیاد پر ناکام رہی تاہم اسے حتمی ناکامی سے دوچار کرنے میں آئی ایس پی آر میں لیفٹیننٹ کرنل سید تحصیل احمد (مرحوم و مغفور) کا بھی ہاتھ تھا جنہوں نے واضح الفاظ میں کتاب کی اشاعت کے لئے کلیئرنس سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔ اس حوالے سے مزید تفصیلات تو میں ''آئی ایس پی آر میں قیام کی رُوداد'' کے بیان میں پیش کروں گا۔

میرے خیال سے میری کتاب ''کاکولیات'' کی موجودگی میں پی ایم اے کے شب و روز یہاں دہرانے کا فائدہ نہیں البتہ یہ ذکر ضروری ہے کہ ہمارا کورس 19 اگست 1972ء کو پاس آؤٹ ہوا۔ میں ایبٹ آباد سے لاہور گھر پہنچ گیا اور چند روز کے بعد الاٹ شدہ یونٹ 23 فیلڈ رجمنٹ میں شامل ہونے کے لیے سیالکوٹ چھاؤنی روانہ ہو گیا۔ ابھی پاک بھارت جنگ سیز فائر کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ یونٹ سیالکوٹ کے محاذ پر تعینات تھی، میرے علاوہ سیکنڈ لیفٹیننٹ جاوید اقبال اور سیکنڈ لیفٹیننٹ سعید اصغر کو بھی 23 فیلڈ رجمنٹ میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ یہ یونٹ فوج میں ''گنز آف واہگہ'' کے تعارفی نام سے بھی پہچانی جاتی ہے۔ اس یونٹ نے ستمبر 1965ء کی جنگ میں لاہور کے محاذ پر حملہ آور دشمن کے خلاف پہلا گولہ فائر کیا تھا۔ لاہور کی جنگ میں توپ خانے کا کردار بہت اہم اور کسی حد تک فیصلہ کن بھی تھا۔

.....

یونٹ میں زیادہ مدت قیام نہیں ہوا۔ ینگ آفیسرز آرٹلری کورس کے لئے نوشہرہ جانے کا حکم صادر ہو گیا۔ میرے ہمراہ سیکنڈ لیفٹیننٹ جاوید اقبال اور سیکنڈ لیفٹیننٹ سعید اصغر بھی تھے۔ ہم ایک ساتھ عازم نوشہرہ ہوئے جہاں تعلیم و تربیت کا ایک کٹھن مرحلہ منتظر تھا۔ میرے لئے تو یہ مرحلہ انتہائی سنگین تھا کیونکہ میں نے کبھی سائنس نہیں پڑھی تھی۔ ابتداء ہی سے آرٹس مضامین کا طالب علم تھا۔ پی ایم اے پاسنگ آؤٹ سے قبل کیڈٹس سے پسندیدہ یونٹ کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے۔ میں نے 23 فیلڈ رجمنٹ کی چوائس لکھ دی کیونکہ اس یونٹ میں میرے تایازاد بھائی سید ثمر مہدی میجر کے رینک پر فرائض انجام دے رہے تھے۔ نوشہرہ جانے سے پہلے یونٹ میں ابتدائی تربیت کا انتظام بھی کیا گیا

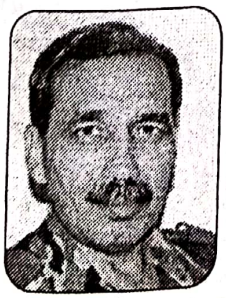

بریگیڈیئر عثمان حسن نے تقریباً روزانہ واقعات قلمبند کرنا شروع کر دیئے، آپریشن مکمل ہونے کے بعد یہ ڈائری ایک کتاب بعنوان ''بلوچستان، ماضی، حال اور مستقبل'' کراچی سے شائع ہوئی

Scanned with CamScanner

گرفتار ہونے والے پچانوے فیصد شورش پسند اردگرد کے ماحول ہی سے بے خبر تھے

سردار ہی ان کے لیے زمین و آسمان تھا

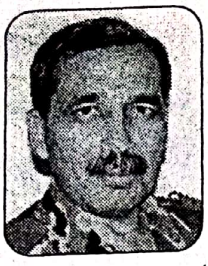

تھا۔ ہم میں سے سعید اصغر سب سے زیادہ لائق نوجوان افسر تھا۔ اس نے یونٹ کے انسٹرکٹرز کو متاثر کیا۔ جاوید اقبال کو بھی شاباش مل جاتی تھی، البتہ میرے بارے میں انسٹرکٹر حوالدار کا خیال تھا کہ ''سر! آپ تو یونٹ کے نام پر ایک بوجھ ہی ثابت ہوں گے، ہم دعا ہی کر سکتے ہیں''۔ اس افسردگی کے ماحول میں آرٹلری سکول نوشہرہ میں رپورٹ کی تو دن میں تارے نظر آ گئے۔ شانے پر ایک پھول آویزاں تھا لیکن ''رگڑے'' کے لحاظ سے کیڈٹ لائف کا دور پھر لوٹ آیا تھا۔ کلاس رومز میں میجر رینک کے انسٹرکٹر تھے جن کے لیکچر اکثر سر کے اوپر ہی سے گزر جاتے تھے۔ البتہ پریکٹیکل کے دوران ہاتھ پاؤں مار لیتا تھا۔ ابھی تین ماہ ہی گزرے تھے اور تربیتی رگڑا عروج پر تھا کہ سہ پہر کی ''ٹی بریک'' کے موقع پر ایک ہم جماعت کہیں سے پکوڑے سموسے لے آیا۔ اخباری کاغذ کا لفافہ تھا۔ بہت دنوں بعد اخبار کا ٹکڑا دکھائی دیا۔ میں نے سموسے رکابی پر رکھ دیئے اور اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ اچانک میری نظر ایک اشتہار پر گئی جس میں پاک افواج کے لئے پی آر اوز کی اسامیاں مشتہر کی گئی تھیں۔ مطلوبہ تعلیم ایم اے صحافت تھی۔ میں نے اخباری ٹکڑا سنبھال لیا اور اگلے روز اشتہار میں دیئے گئے پتے پر ایک خط لکھ دیا۔ ایک ہفتے بعد جواب آ گیا اور ہمراہ آرمی کمیشن کا فارم تھا۔ میں نے کسی سے مشورہ کئے بغیر فارم پُر کیا اور روانہ کر دیا۔ چند روز گزر گئے کہ ایک دن کلاس میں آواز گونجی کہ سیکنڈ لیفٹیننٹ صولت رضا کو کمانڈنٹ بلا رہے ہیں۔ یہ بلاوا انتہائی تشویشناک تھا۔ میں پی آر او کے فارم وغیرہ بھول چکا تھا۔ کمانڈنٹ کے دفتر میں عسکری ضوابط کے مطابق پہنچایا گیا۔ سامنے لیفٹیننٹ کرنل غلام حسین قائمقام کمانڈنٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی جس کے دوران ہر دوسرے جملے کے بعد فرما رہے تھے کہ تم فوج میں رہنے کے قابل نہیں ہو۔ کبھی کمیشنڈ افسر بھی دوبارہ کمیشن کے لئے اپلائی کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ سر مجھے یہ فارم جی ایچ کیو کی متعلقہ برانچ نے بھیجے تھے۔ میں نے خط میں خود کو سیکنڈ لیفٹیننٹ لکھا تھا۔ قائمقام کمانڈنٹ کی آواز گونجی کہ ''کوئی کلرک ہو گا تمہاری طرح کا..... اب ہم تمہارے خلاف ضابطے کی کارروائی کریں گے''۔ ایک انکوائری افسر مقرر کر دیا گیا ہے۔ تم اپنا تحریری بیان 24 گھنٹے میں جمع کروا دو، اینڈ گیٹ آؤٹ!

قائمقام کمانڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل غلام حسین کی بھرپور خاطر تواضع کے بعد سیکنڈ لیفٹیننٹ صولت رضا جب کلاس میں واپس پہنچے تو انسٹرکٹر میجر گلزار پہلے سے تیار تھے۔ انہوں نے نصاب کی تدریس ترک کر کے غیر نصابی انداز میں رہی سہی کسر پوری کر دی۔ انہوں نے پوری کلاس کو یہ مژدہ سنایا کہ ''تمہاری صفوں میں ایک کالی بھیڑ موجود ہے جس نے آج سارے توپچی افسروں کی ناک کٹوا دی ہے۔ یہ آئی

Scanned with CamScanner

ایس پی آر میں پی آر او بھرتی ہونا چاہتا ہے۔ بھرتی سے پہلے بھرتہ بنائیں گے''۔ بہرحال کسی طور کنچ بریک ہوئی تو عارضی طور پر جان میں جان آئی۔ میں کمرہ میں واپس آیا اور اپنے ایک ہم جماعت سے مشورہ کیا جو ایل ایل بی تھے تو انہوں نے انکوائری کا جواب تیار کرنے میں مدد کی جس میں یہ دلیل نمایاں کی گئی کہ خط کتابت سرکاری دفاتر کے مابین ہوئی ہے۔ اس میں افسر سے دانستہ نہیں بلکہ سہواً غلطی کا احتمال موجود ہے۔ چند ماہ کی ملازمت کو مد نظر رکھتے ہوئے درگزر کر دیا جائے، آئندہ افسر محتاط رہے گا۔ انکوائری افسر ایک سینئر انسٹرکٹر میجر تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی بھرپور ''گولہ باری'' کریں گے لیکن موصوف بڑی شفقت سے پیش آئے۔ دفتر میں موجود ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کے لئے اعزاز کی بات تھی۔ انہوں نے واجبی سی تنبیہ کی جو شاید فائل کا پیٹ بھرنے کے لئے لازمی تھی۔ اس کے بعد فائل ایک جانب رکھ کر فرمانے لگے کہ ''تمہارا موقف درست ہے۔ آپ بیسک کورس میں جو عرصہ رہ گیا ہے اسے مکمل توجہ کے ساتھ مکمل کریں اور یونٹ واپس جا کر دوبارہ کوشش کرنا۔ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں ایک مرتبہ غلطی کی معافی ہے۔ وہ تو تم کو مل گئی ہے''۔

آرٹلری سکول نوشہرہ میں باقی وقت آرام اور اطمینان سے گزرا۔ کورس مکمل ہوا تو ہم تینوں سیکنڈ لیفٹیننٹ واپس سیالکوٹ چھاؤنی پہنچے جہاں سے ''اگلے مورچوں'' پر پہنچایا گیا۔ ابھی جنگ دسمبر 1971ء کے بعد سیز فائر کا مرحلہ جاری تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ زیر زمین مورچے روشن تھے تاہم توپوں کے مورچے کیموفلاج کئے گئے۔ رات کے اندھیرے میں دور یا نزدیک سے ہری بھری جھاڑی کا گمان گزرتا تھا۔ ہم تینوں باوردی حالت میں سیکنڈ لیفٹیننٹ زیر زمین آفیسرز میس میں داخل ہوئے تو ڈنر کا وقت قریب تھا۔ یونٹ کے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل غلام مرتضیٰ دیگر افسروں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہم تینوں کو خوش آمدید کہا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے نرم الفاظ میں شدید اظہار برہمی کیا۔ یونٹ کو آرٹلری سکول نوشہرہ سے میرے کارنامے کی اطلاع مل چکی تھی۔ فرمانے لگے ''تمہاری حرکت ایک دھبہ ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ''گنر آف واہگہ'' جیسی یونٹ کا سیکنڈ لیفٹیننٹ کسی اور جگہ جانے کا سوچے گا''۔ ان کے الفاظ گرم سیسے کی مانند میرے کان میں گر رہے تھے۔ کمانڈنگ افسر کا یہ موڈ دیکھ کر باعزت خاموشی ہی بہتر تھی۔ اچانک سی او کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا: آپ کھانا کھایئے میں اپنے مورچے میں جا رہا ہوں۔ یہ واضح اظہار ناراضی تھا۔ ان کے جانے کے بعد یونٹ کے دیگر افسروں نے بھی حصہ بقدر جثہ ''تواضع'' کی۔ میرے ساتھ اخبارات اور میڈیا کی شان میں بھی ''سپاس نامے'' پیش کئے جا رہے تھے۔ اپنی رجمنٹ، یونٹ اور آرم (عسکری شعبے

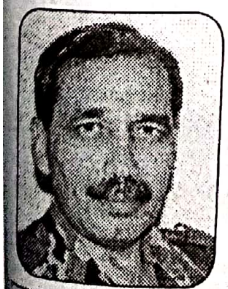

بھٹو صاحب کی حکمت عملی یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں ہزیمت کی تمام ذمہ داری فوج ہی پر رہے اور جذباتی قوم کے سامنے پلٹن میدان میں سرنڈر کی تصاویر اور فلمیں پیش کر کر کے سیاسی رہنماؤں کے براہ راست ملوث ہونے کو اذہان سے نکال دیا جائے

Scanned with CamScanner

ضیاءالحق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹک قلعے کی یادیں تازہ کرنا شروع کردیں، انہوں نے اپنے سٹاف افسر سے کہا: ''بلوچستان میں قیام کے دوران کچھ وقت صولت صاحب کیلئے رکھنا ہے، میں نے گپ شپ کرنی ہے''

جیسے آرٹلری، انفینٹری، آرمرڈ وغیرہ) پر فخر کرنا ہر فوجی کی شان اور فرائض منصبی کا جزو شمار ہوتا ہے۔ یہ کیفیت اسے میدان جنگ اور زمانہ امن میں بے تکان مصروف عمل رکھتی ہے۔

چند روز تک میرے ساتھ ''حسن سلوک'' جاری رہا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ منفی جذبات سرد پڑ گئے۔ یونٹ کے کچھ حصے چھاؤنی منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ میں ایک روز اگلے مورچے سے چھاؤنی کی جانب آ رہا تھا، بارش کے باعث کھیت کھلیان پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ کچے راستے اور پگڈنڈیاں کیچڑ سے اٹ گئے تھے۔ جیپ ڈرائیونگ دشوار سے دشوار تر ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ اگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ ڈرائیونگ مشکل ہے تو ٹھہر جاتے ہیں۔ بارش رکنے کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا ''سر! آپ نئے آئے ہیں۔ یہ پنجاب کی بارش ہے۔ جھڑی لگ گئی ہے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہیں''۔ حد نظر تک دیہات کے رہنے والے بھی کام کاج میں مصروف دکھائی دیئے۔ اس دوران میں نے پگڈنڈی پر ایک بچہ دیکھا، عمر پانچ چھ برس ہوگی۔ وہ ہماری جانب سرپٹ بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو بھاگتے ہوئے بچے کی نشاندہی کی، بچہ پگڈنڈی کے کنارے بمشکل رُکا اور فوجی انداز میں ہمیں سلیوٹ کیا۔ میں نے بھی سکھلائے ہوئے طریقے سے ناقابل فراموش سلیوٹ کا جواب دیا۔ جی چاہا کہ جیپ روک کر بچے سے ہاتھ ملاؤں۔ بات چیت کروں لیکن جیپ آگے نکل گئی تھی۔ بچہ پگڈنڈی کے کنارے کھڑا ہاتھ ماتھے پر اٹکائے شاید جیپ کے نظروں سے اوجھل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ سلیوٹ میری نگاہوں میں جم گیا۔ چھاؤنی پہنچا، کام کی مصروفیت کے باوجود بچے کا بلند ہوتا ہوا ہاتھ اور کیچڑ میں پگڈنڈی پر دوڑ لگا کر آرمی جیپ کے قریب آنا مجھے محسوس ہوا کہ سولہ دسمبر 71ء کی ہزیمت عارضی ہے۔ قوموں کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ خیال آیا کہ جنگ اُحد کا نتیجہ جنگ بدر سے مختلف تھا لیکن اس کے باوجود ''خندق'' کی تیاری ہوئی اور مسلمانوں نے حتمی فتح کے لئے تمام دشواریوں پر قابو پالیا۔ ہمیں بھی اپنے حوصلے بلند رکھتے ہوئے جامع حکمت عملی کے ساتھ منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ پاکستان بھارت کے درمیان شملہ معاہدے کے بعد افواج کی مرحلہ وار واپسی شروع ہوگئی تھی، میری یونٹ بھی سیالکوٹ چھاؤنی واپس آ گئی۔ یوں ''زمانہ امن'' کی مصروفیات میں اضافہ ہوگیا۔ صبح صبح پی ٹی کے لئے تیاری، وقفے کے بعد پیریڈ، دفتری امور کی انجام دہی، لنچ اور ڈریس تبدیل کر کے سپورٹس گراؤنڈ میں خود کو سینئرز اور جونیئرز کے سامنے خود کو سب سے زیادہ چاق و چوبند ظاہر کرنا۔ مغرب کے بعد میس لائف جہاں ڈسپلن پہلے اور ڈنر بعد میں میسر تھا۔ یہ ایک نوجوان کنوارے افسر کے شب و روز تھے۔ اس زمانے (1972-1973ء) میں موبائل فون نہیں تھے۔

Scanned with CamScanner

کسی ایک افسر کے پاس موٹر سائیکل ہوتی تھی۔ ذاتی موٹر کار شاید صرف کمانڈنگ افسر کی تھی۔ سیالکوٹ چھاؤنی واپس آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ لیفٹیننٹ کرنل غلام مرتضیٰ ''پوسٹ آؤٹ'' ہو گئے اور ان کی جگہ لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین کو تعینات کر دیا گیا۔ کمانڈنگ افسر کی تبدیلی کے باعث یونٹ میں تازہ دم کیفیت عود کر آئی۔ ہر کوئی کمانڈنگ افسر کے احکامات کا منتظر تھا۔ انہوں نے یونٹ کے افسروں سے دفتر میں انفرادی ملاقاتیں شروع کیں، جب میری باری آئی تو میں خاصا پریشان تھا۔ پوسٹ آؤٹ ہونے والے کمانڈنگ افسر نے خاصی ''گوشمالی'' کر دی تھی۔ بس یونٹ سے ٹھڈے مار کر نکالنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ سی او (کمانڈنگ افسر) کے آفس کے باہر کھڑے چاق و چوبند جوان نے پکارنے کے انداز میں کہا ''سر! سی۔ او یاد کر رہے ہیں''۔ یہ سنتے ہی میں نے امید اور غیر یقینی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ خود کو سی۔ او آفس میں ''دھکیل'' دیا۔ میں نے سلیوٹ کیا ہی تھا کہ لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین نے بلند آہنگی کے ساتھ وعلیکم السلام کہا اور اپنی نشست سے کھڑے ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ یہ سب میرے لیے غیر متوقع تھا۔ انہوں نے جب ''پلیز سٹ ڈاؤن'' کہا تو مجھے یقین نہیں آیا کیونکہ کمیشنڈ افسر بننے کے بعد سی۔ او آفس میں پہلی مرتبہ یہ آواز سنی تھی۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ انہوں نے انگریزی میں پوچھا: ''گرین ٹی، ملک ٹی یا کافی؟''

میں سمجھا کہ اب میرا جواب سن کر زور دار قسم کا ''گیٹ آؤٹ'' بلند ہوگا۔ خیر! گرین ٹی پر اتفاق ہو گیا۔ انہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ بات کرتے ہوئے کہا: ''مجھے تمہارے بارے میں سب معلوم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے دیانتداری سے بات کی ہے۔ آئی ایس پی آر ہی تمہارے لیے مناسب رہے گا اور تم زیادہ بہتر انداز میں خدمات انجام دے سکتے ہو لیکن جب تک یونٹ میں موجود ہو اپنے فرائض پوری توجہ اور اخلاص کے ساتھ انجام دینے ہیں۔ سینئرز سے سیکھنے کی کوشش کرو۔ جونیئرز کے ساتھ ایک معلم کی مانند برتاؤ کرو۔ اس کے علاوہ یونٹ لائبریری کی دیکھ بھال بھی کرو گے۔ تازہ بھرتی ہونے والے جوانوں کی تعلیمی استعداد کا جائزہ ضروری ہے۔ کچھ کے مسائل شاید تمہاری طرح ہوں''۔

یہ جملہ بہت معنی خیز تھا۔ یوں لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین سے پہلی ملاقات نے خوف، بے یقینی اور پیشہ وارانہ تنہائی کا ازالہ کر دیا۔ اب میں یونٹ کا فعال رکن تھا۔ مجھے توقع تھی کہ ایک روز آئی ایس پی آر سے طلبی کا پروانہ ضرور آئے گا اور بنجارہ اپنی کتابیں اور اخبارات لاد کر راولپنڈی روانہ ہو جائے گا۔ کمانڈنگ افسر کی حوصلہ افزائی رنگ لائی۔ میں نے سرحدی گاؤں کے بچے کا یادگاری سلیوٹ یاد کیا اور اسے ایک مضمون میں ڈھال کر پاک فوج کے ترجمان جریدے ''ہلال'' کو روانہ کر دیا۔ تب یہ

بھٹو صاحب نے اپنا گلاس لہراتے ہوئے کہا: ''میں تو پی رہا ہوں''، اس موقع پر جنرل ضیاء الحق نے وزیر اعظم کو تاریخی جملہ کہا "Sir!You are above the law"

یہ جملہ سن کر بھٹو صاحب پھولے نہیں سما رہے تھے

Scanned with CamScanner

طوائف نے کہا آپ اس نیکی کا آغاز میرے ساتھ شادی سے کریں اور اپنے ماتحتوں کو حکم دیں کہ وہ بھی زمین پر بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے کسی ایک سے شادی کر لے

ہفت روزہ تھا اور یونٹ میں بآسانی دستیاب ہوتا تھا، صفحات تیس بتیس ہوتے تھے۔ بلیک اینڈ وائٹ اشاعت تھی۔ زیادہ تر عسکری نوعیت کی سرگرمیوں کے بارے میں خبریں، تصاویر اور مضامین نمایاں ہوتے تھے۔ میرا مضمون ''سلیوٹ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ کے رینک کے ساتھ یہ میرا پہلا اور آخری مضمون ہے جو ہلال میں شائع ہوا۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ انہوں نے پچاس روپے انعام کے ساتھ یونٹ کے اجتماع میں پڑھنے کا حکم بھی صادر کیا۔ بعد ازاں ہلال سے بھی تیس روپے اعزازیہ موصول ہوا۔ یونٹ اجتماع میں تمام افسر، جونیئر کمیشنڈ افسر اور جوانوں کی موجودگی میں مجھے اپنا مضمون پڑھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ کمانڈنگ افسر نے اپنی تقریر میں خوب تعریف کی۔ میں اللہ کریم کا شکر ادا کر رہا تھا۔ چند ہفتے سے مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یونٹ میں ''گناہ کبیرہ'' کے مرتکب کی مانند شب و روز گزر رہے تھے۔ اچانک کمان تبدیل ہوئی اور ایک شخصیت کی بدولت پسند کی شاہراہ پر گامزن ہو گیا۔ یونٹ میں میرے دونوں کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل غلام مرتضیٰ اور لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین آج دنیا میں موجود نہیں ہیں، اللہ کریم ان کے درجات بلند فرمائیں۔ آمین۔

کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل غلام مرتضیٰ ''فل کرنل'' کے عہدے تک پہنچے۔ دو تین مرتبہ ان سے راولپنڈی میں ملاقات ہوئی۔ سراپا گنر آفیسر (Gunner Officer) تھے۔ پیشہ وارانہ لحاظ سے دیانتدار اور ہر معاملے میں مکمل پرفیکشن چاہتے تھے۔ بے پناہ خوبیاں تھیں جن سے ان کے سینئرز اور جونیئرز مستفید ہوتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد فیصل آباد میں مقیم تھے۔ ایک روز گھر سے باہر چہل قدمی کر رہے تھے کہ موٹر سائیکل سوار دو افراد نے چھینا جھپٹی کی کوشش کی۔ ان سے گتھم گتھا ہو گئے، ایک رہزن نے فائر کیا اور موقع ہی پر واصل بحق ہو گئے۔ اللہ کریم غریق رحمت فرمائیں۔ آمین۔

دوسرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین ریٹائرمنٹ کے بعد آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے ایک پروجیکٹ کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ ڈیوٹی پنو عاقل چھاؤنی کے گرد و نواح میں تھی۔ انہوں نے پیشہ وارانہ مہارت اور حکمت عملی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین سے براہ راست یا بالواسطہ رابطہ رہا۔

کراچی سے نوے کی دہائی کے وسط میں واپس آئی ایس پی آر راولپنڈی تعینات ہوا تو کبھی کبھار ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ عارضہ قلب کے باعث آرمڈ فورسز انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی (آر ایف آئی سی) راولپنڈی میں زیر علاج رہے۔ جب کبھی ڈاکٹر سے چیک اپ کے لئے تشریف لاتے تو آئی ایس پی آر بھی آتے تھے۔ دفتر کے ساتھیوں کو علم تھا کہ کرنل حسین میرے کمانڈنگ افسر

Scanned with CamScanner

رہ چکے ہیں۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی میرے آفس میں ''ہٹو بچو'' کا ماحول ہو جاتا تھا۔ میں انہیں روز اول کا پروٹوکول دیتا تھا اور محض سیکنڈ لیفٹیننٹ بن کر آداب بجا لاتا تھا۔ ایک روز آفیسر واش رومز کی جانب گئے۔ میں ڈی جی آئی ایس پی آر کے آفس میں تھا کہ میرا پی اے بھاگتا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے کہنا لگا ''سر! آپ کے سی۔ او صاحب واش رومز میں موجود ہیں اور غصے کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ اپنے بریگیڈیئر کو ابھی بلاؤ۔ ادھر بلاؤ'' میں سمجھا کہ خدانخواستہ پھسل نہ گئے ہوں۔ لہٰذا ڈی جی سے اجازت لے کر فوراً واش رومز کی جانب بھاگا۔ قریب گیا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ کرنل محمد حسین غصے کے عالم میں تھے، میں جونہی سیکنڈ لیفٹیننٹ کے انداز میں پیش ہوا تو انہوں نے برسنا شروع کر دیا۔ دفتر کے دیگر باوردی اور سول اہلکار بھی سن رہے تھے۔ الفاظ ایسے تھے کہ کبھی پہلے کمانڈنگ افسر نے نہیں بولے ہوں گے۔ کہنے لگے: ''یہ واش رومز کی کیا حالت ہے۔ تم سارا دن کرسی پر بیٹھے رہتے ہو۔ کبھی چکر بھی لگا لیا کرو۔ اپنی شکل کبھی واش رومز کے شیشے میں بھی دیکھ لیا کرو کہ صحیح دکھائی دے رہی ہے یا نہیں''۔ میں نے سر کہہ کر کچھ کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے بلند آواز میں خاموش کرا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ آج خاموشی سے سن لیا جائے۔ بزرگ ہیں اور ہر معاملے کو اپنے زمانے کے معیار پر جانچ رہے ہیں۔ مزید میرا دفتر خالص فوجی بھی نہیں تھا، یہاں ڈسپلن بھی ''ملی جلی'' کیفیت ہی میں نافذ رہتا ہے۔ بہرحال بہت مشکل سے غصہ ٹھنڈا ہوا۔ مجھے ان کی صحت کی فکر تھی۔ عارضہ قلب کے مریض کو زیادہ غصہ اور ٹینشن نقصان دہ ہوتی ہے۔ واش رومز سے میرے دفتر تک آتے آتے انہوں نے عسکری دفاتر میں صفائی کی اہمیت پر مختصر مگر جامع نکات بیان کئے۔ بہرحال اس روز موڈ بہت آف تھا۔ بمشکل سبز چائے کے چند گھونٹ انڈیلے اور واپس واہ چھاؤنی روانہ ہو گئے جہاں ریٹائرمنٹ کے بعد قیام پذیر تھے۔

یہ سارا واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ فوج میں سینئر جونیئر کا ربط باہمی صرف ملازمت کے دورانیہ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ یہ تاحیات ایک بلاعنوان رشتے داری ہے جس سے خون اور پسینے کی مہک آتی ہے۔

آیئے دوبارہ سیالکوٹ چھاؤنی چلتے ہیں۔ یونٹ میں معمول کے شب و روز گزر رہے تھے۔ ایک دن پی ٹی کا پیریڈ جاری تھا کہ اچانک ایڈجوٹنٹ (کیپٹن) گراؤنڈ میں آئے اور مجھے طلب کر کے ''ناقص کارکردگی'' پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ میں حیران و پریشان تھا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے اور بھی افسر اٹھک بیٹھک میں مصروف ہیں۔ فزیکل ٹریننگ جاری ہے۔ یہ مجھے کیوں بآواز بلند پی ایم اے گراؤنڈ کے ''نقرئی الفاظ'' سے نوازا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ لنچ بریک اور سپورٹس پیریڈ تک جاری

سرکار احکامات پر عمل درآمد کے عوض تنخواہ
دیتی ہے جبکہ گھر کی حکومت کو تنخواہ دے کر
احکامات وصول کرتے ہیں

Scanned with CamScanner

جنرل محمد ضیاء الحق ذاتی طور پر بھی اہم اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے اداریے اور کالم بھی پڑھتے تھے، یہ صورتحال سمری تیار کرنے والے عملے کے لیے ''پریشان کن'' تھی

رہا۔ اللہ بھلا کرے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد حسین کا کہ انہوں نے سپورٹس پیریڈ کے اختتام پر جب لیموں پانی کا دور چل رہا تھا مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ تمہارا آئی ایس پی آر کے ساتھ عارضی ڈیوٹی کا حکمنامہ موصول ہوگیا ہے۔ اسی ہفتے راولپنڈی رپورٹ کرنی ہے۔ یہ خوشخبری سن کر اوسان بحال ہوئے جو صبح سے ڈانٹ ڈپٹ کے باعث بار بار خطا ہو رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ حکمنامہ سگنل کی صورت میں صبح موصول ہو گیا تھا۔ ایڈجوٹنٹ عسکری روایات کے مطابق یونٹ سے رخصتی کا ''پہلا بلاوا'' پر عمل پیرا تھے۔ آئی ایس پی آر روانگی کی خوشی اپنی جگہ لیکن 23 فیلڈ رجمنٹ سے پیشہ وارانہ علیحدگی کا دکھ اور افسوس بیان سے باہر تھا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے یونٹ میں شمولیت اختیار کی۔ اب لیفٹیننٹ تھا۔ ایک برس سے زائد کا عرصہ گزرا۔ محاذ پر رہے۔ ٹریننگ کے لئے شب و روز بھاگ دوڑ کی۔ عملی مظاہرے ''ٹلہ رینج'' میں ہوئے۔ سینئر افسروں، جونیئر کمیشنڈ افسروں اور جوانوں سے 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے واقعات سنے۔ دل میں خواہش ابھرتی کہ کاش ہمیں بھی ایسے مواقع میسر آئیں کہ پاک سرحدوں کی جانب بڑھتے ہوئے دشمن کے سر پر توپوں سے آگ برسائیں اور اس کے ناپاک عزائم ملیامیٹ کر دیں۔ آئی ایس پی آر میں عارضی تعیناتی کا حکمنامہ موصول ہونے کے بعد چند روز یونٹ میں اس انداز میں گزرے کہ ہر لمحہ ''الوداعی'' تھا۔ یونٹ میں ''بڑا کھانا'' ہوا۔ مصافحہ اور معانقہ کا دور چلا۔ گرم جوشی کے یہ لمحات زندگی بھر کا عظیم سرمایہ بن گئے۔

ایک روز سیالکوٹ سے راولپنڈی کی بس میں سوار ہوا۔ ایک ٹرنک رنگ سیاہ اور بستر بند ہمراہ تھے۔ لیاقت باغ راولپنڈی کے بس اڈے پر پہنچے تو دن ڈھل چکا تھا۔ ٹرنک پر بستر بند رکھے ہلال روڈ جانے کے لئے کسی سواری کے انتظار میں تھا۔ ایک ٹانگے والا قریب کی سواری سمجھ کر آمادہ ہوگیا۔ صدر بازار سے ہوتے ہوئے ہلال روڈ پہنچے۔ آئی ایس پی آر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ ابھی مغرب میں کچھ وقت تھا کہ میں دفتر کی حدود میں داخل ہوگیا۔ صرف دو کمروں سے روشنی آرہی تھی۔ ایک کمرے میں داخل ہو کر اپنا تعارف کروایا تو جواب آیا بیٹھ جائیں ابھی شبیر صاحب آتے ہیں۔ دس منٹ کے بعد ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی پنجابی میں چلانا شروع کر دیا، یہ ٹانگے پر کون آیا ہے؟ باہر گھوڑے نے پیشاب کر دیا ہے اور کوچوان بھی غائب ہے۔ یہ کیا تماشا ہے (اردو ترجمہ میرا ہے)۔ میں نے تعارف کروایا کہ ''لیفٹیننٹ صولت رضا، فرام 23 فیلڈ رجمنٹ، رپورٹنگ فار ڈیوٹی اِن آئی ایس پی آر''۔ ''کون لیفٹین، میں نہیں جانتا۔ ادھر کوئی جگہ نہیں، کس نے بھیجا ہے۔ یہ پیشاب کون صاف کرائے گا۔ ابھی ڈائریکٹر صاحب (بریگیڈیئر) آ گئے تو کون جواب دے گا''۔ یہ

Scanned with CamScanner

ڈانٹ ڈپٹ سن کر حواس باختہ ہونے کے قریب تھا کہ قریب بیٹھے ہوئے چپراسی نے مجھے کہا ''آپ کے پاس کوئی کاغذ ہے تو شبیر صاحب کو دکھاؤ''۔ اب پتہ چلا کہ یہ شبیر صاحب ڈیوٹی کلرک ہیں اور شام کو دفتر میں ''آل اِن آل'' ہوتے ہیں۔ یونٹ سے روانگی کا پروانہ ''آل اِن آل'' کے سامنے رکھا لیکن مزاج یار پر گھوڑے کی فطری لغزش سوار تھی۔ چند لمحات شش و پنج میں گزرے۔ لمبا سانس لیا تو ''رگِ کیفٹینی'' نے پھڑکنا شروع کر دیا۔ ''میری کسی افسر سے بات کروائیں'' میں نے کہا۔ یہ جملہ تو گھوڑے کی ناگوار حرکت سے بھی زیادہ آتشیں ثابت ہوا۔ شبیر صاحب کا موڈ مزید آف ہو گیا۔ بہر حال ایک قریبی آفس میں ٹیلی فون دکھائی دیا۔ میں نے وہاں سے میجر سید عقیل احمد کو کال ملائی۔ انہوں نے میرا نام سنتے ہی کہا کہ ہاں میاں کب پہنچے؟ کیسے پہنچے؟ کہاں ہو؟۔ سر! میں آئی ایس پی آر دفتر میں موجود ہوں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ ایک صاحب کہہ رہے ہیں ''آئی ایس پی آر میں لیفٹین کا کوئی کام نہیں واپس یونٹ چلے جاؤ''۔ جواب میں قہقہہ بلند ہوا، کہنے لگے ''گھبراؤ نہیں۔ میں پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں''۔ میجر سید عقیل احمد رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے۔ سکوٹر پر سوار مسکراتے ہوئے جونہی دفتر یں پہنچے میں نے کرایہ دے کر کوچوان کو رخصت کیا۔ میجر عقیل ابھی کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ شبیر صاحب نے گھوڑے کی ناگوار حرکت کے بارے میں آہ و بکا شروع کر دی۔ میجر عقیل مسلسل مسکراتے رہے اور کہا ''غم نہ کرو، جو ہونا تھا ہو گیا، صبح تک سب خشک ہو جائے گا۔ جانور کا کیا ہے۔ پریڈ میں ڈائس کے سامنے تمام تر کوشش کے باوجود گھوڑے لید کر دیتے ہیں، اب کیا کریں''۔ انہوں نے یہ کہہ کر شبیر صاحب کو رخصت کیا اور میری جانب متوجہ ہو گئے۔ آرڈی نس لال کرتی میں رہائش کا انتظام کروایا۔ میس پہنچا تو ایک تنگ و تاریک چھوٹا سا کمرہ منتظر تھا۔ چند روز میں یونٹ سے ''مددگار'' بھی باقی ساز و سامان کے ساتھ پہنچ گیا تو رہن سہن بہتر ہو گیا۔ بیس روپے مہینے پر سائیکل کرایہ پر مل گئی۔ یوں آرڈی نس میس لال کرتی سے ہلال روڈ تک باوردی حالت میں سائیکلنگ کا لطف اٹھانے لگا۔ یہ اکتوبر 1973ء کا ذکر ہے۔ سائیکل رواں رکھتے ہوئے سینئرز کو سلیوٹ کرنا اور جونیئرز کو سلیوٹ کا جواب دینا ایک علیحدہ مشقت تھی۔ اسے رواں سائیکل پر انجام دینا پریکٹس کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ خیر! اس فرض کی خاصی پریکٹس سیالکوٹ چھاؤنی میں کر چکے تھے، لہٰذا راولپنڈی میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ آئی ایس پی آر میں لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ''دوڑے چل'' کی کیفیت طاری رہی۔ اور ہاں سب سے دلچسپ آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر فضل الرحمٰن سے پہلا انٹرویو تھا۔ ان کا تعلق آرمرڈ کور سے تھا۔ انہیں بریگیڈیئر عبدالرحمٰن صدیقی (اے آر صدیقی) کی جگہ تعینات کیا گیا تھا۔

جنرل محمد ضیاء الحق جب بوائے سکاؤٹس دستے کے ڈائننگ ایریا میں آئے تو انہوں نے بلند آواز سے میری طرف اشارہ کر کے کہا بچو! آج آپ ان انکل کی وجہ سے آئے ہیں

Scanned with CamScanner

صدیق سالک کہنے لگے آپ کہیں گم نہ ہو جانا، تمہیں ساتھ واپس لے کر جانا ہے، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا حکم ہے

آخری جملے کا لہجہ نوکدار تھا

یہ تبدیلی جنرل ٹکا خان نے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ سنبھالتے ہی کی تھی۔ بریگیڈیئر اے آر صدیقی نے آئی ایس پی آر میں کیپٹن کی حیثیت سے کمیشن حاصل کیا تھا۔ اس سے قبل اہم اخبارات سے بھی منسلک رہے تھے۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد متعدد کتابیں بھی تحریر کیں۔ آئی ایس پی آر میں میری آمد سے قبل بریگیڈیئر فضل الرحمٰن تعینات ہو چکے تھے۔ مجھے عسکری ضوابط کے مطابق ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ آفس ٹیبل پر میری فائل تھی۔ میں پی ایم اے کاکول کے انداز میں زمین پر پاؤں مار کر سیلوٹ پیش کیا جس سے موصوف متاثر ہوئے اور فرمانے لگے کہ ''تم تو پکے سولجر ہو۔ پی ایم اے میں ٹریننگ لی ہے۔ آرٹلری سکول نوشہرہ سے ینگ آفیسرز کورس بھی کر لیا ہے۔ یہ آئی ایس پی آر میں کیا لینے آئے ہو؟ فوراً یہاں سے ''دفع'' ہو جاؤ، یونٹ واپس چلے جاؤ۔ یہ بوسیدہ لکڑیوں کا ڈھیر ہے جو کسی کام کا نہیں (سب کچھ بزبان انگریزی اور وہ بھی میدان جنگ کے بادشاہ کے انداز میں) واضح رہے کہ عسکری روایات کے مطابق گھڑسوار (ٹینک دستہ) بادشاہ اور پیدل دستہ (انفنٹری) ملکہ تصور کیے جاتے ہیں۔ دونوں کا ملاپ میدان میں کامیابی کی کنجی ہے۔ یو آر مرڈ کور سے تعلق رکھنے والے افسر اور جوان اکثر بادشاہ کا انداز اور مزاج اپنائے رہتے ہیں۔ بریگیڈیئر فضل الرحمٰن مسلسل عسکری فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ آفس سے باہر نکلتے ہی مجھے یونٹ واپسی کا حکم نامہ مل جائے گا۔ موصوف سانس لینے کے لئے رکے تو میں نے کہا کہ سر! میں نے ایم اے صحافت کیا ہوا ہے، اس لیے آئی ایس پی آر کی جانب رخ کیا ہے۔ اس پر انہیں مزید طیش آ گیا، انہوں نے ایک اور لاجواب قسم کی ڈانٹ پلائی اور کہا کہ ایم اے جرنلزم کے بعد فوج میں منہ اٹھائے کیوں آئے ہو، تمہاری پی ایم اے کاکول اور آرٹلری سکول نوشہرہ میں ٹریننگ پر جو خرچ ہوا ہے وہ تم سے وصول کیا جائے گا۔ چلو اپنی شکل گم کرو اور مجھے دوبارہ نظر مت آنا (بزبان انگریزی)۔

کانپتے ہونٹوں اور لڑکھڑاتی ٹانگوں کے ساتھ باہر نکلا اور سیدھا آئی ایس پی آر کے روایتی افسر سکوارڈن لیڈر (بعد میں ونگ کمانڈر) ایم ایم افضل کے آفس میں داخل ہو گیا۔ اب میرا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے بریگیڈیئر فضل الرحمٰن کے احکامات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے سن کر زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے: ''اوئے آرام سے بیٹھ۔ بابا ہر ایک سے یہی بات کرتا ہے''۔ کل سے کیپ دفتر میں رکھ، ڈھیلے ڈھالے انداز میں سلام دعا کیا کرو۔ یہ پاؤں اٹھا کر سیلوٹ کرنا بند کرو۔ یہ پبلک ریلیشنز کا آفس ہے کوئی پریڈ نہیں ہو رہی ہے۔ اخبار پڑھو، کتاب لائبریری سے ایشو کرواؤ، مضمون لکھو۔ پرانے پریس ریلیز پڑھو۔ تصویروں کی البم دیکھا کرو۔ خود کو آئی ایس پی آر والا سمجھو۔ اب پیچھے مڑ کر

Scanned with CamScanner

نہیں دیکھنا''۔

ونگ کمانڈر افضل کی باتوں سے حوصلہ ہوا۔ میجر سید عقیل احمد بھی معمولی کارکردگی پر اعلیٰ درجے کی تھپکی دیا کرتے تھے۔ ابھی میری تعیناتی عارضی تھی لہٰذا ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ آج کوئی غلطی ہوئی یا ڈائریکٹر نے دیکھ لیا تو واپسی کا پروانہ مل جائے گا۔ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اک روز 1971ء کے جنگی قیدیوں کی واہگہ راستے واپسی کا شور بلند ہوا۔ آئی ایس پی آر لاہور کے آفس کو مزید مضبوط کرنا تھا۔ مجھے راولپنڈی سے ''شکل گم کرو'' حکم مل گیا اور آخری جنگی قیدی کی واپسی تک لاہور آفس سے منسلک کر دیا گیا۔ لاہور میں آئی ایس پی آر کا دفتر مین روڈ گلبرگ میں ایک پرائیویٹ بنگلے میں تھا۔ صبح واہگہ سرحد پر جنگی قیدیوں کی کوریج اہم ڈیوٹی تھی۔ لاہور آفس کے نگران کیپٹن محمد ارشد بعض سرکاری معاملات کے باعث آفس نہیں آ رہے تھے، لہٰذا دن رات سرکاری ''مشقِ سخن'' جاری تھی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں والدین مقیم تھے لیکن میرا زیادہ وقت آئی ایس پی آر آفس ہی میں بسر ہوتا تھا۔ واہگہ سرحد پر جنگی قیدیوں کے آخری گروپ کی واپسی کے موقع پر خصوصی تقریب ہوئی۔ اس گروپ میں سینئر فوجی اور سول افسر شامل تھے۔ سب سے آخر میں (سابق) ایسٹرن کمان کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے سرحد پار کی اور استقبالیہ قطار سے ہاتھ ملاتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

میں نے صدیق سالک کو سب سے پہلے واہگہ کی سرحد پر ایک جنگی قیدی کے روپ میں دیکھا تھا۔ انہوں نے چند لمحے پہلے سرحد عبور کر کے طویل قید سے رہائی حاصل کی تھی اور آئی ایس پی آر کا ''نوآموز لیفٹیننٹ'' پی آر او ڈھاکہ میجر صدیق سالک (بعد میں بریگیڈیئر) کا استقبال کرنے میں مصروف تھا۔ وہ اپنے ہمراہ سقوط ڈھاکہ اور بھارتی قید کا آنکھوں دیکھا حال لائے تھے جسے انہوں نے پھر ''ہمہ یاراں دوزخ''، ''وٹنس ٹو سرنڈر'' اور ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' جیسی کتابوں میں قلمبند کیا۔ ان کے نزدیک ابھی مشرقی پاکستان کی کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے دوٹوک انداز میں لکھ رہے تھے۔ Pakistan Needs Politics اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی، اس انگریزی کتاب کا مسودہ مبینہ طور پر لاپتہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ سالک صاحب ایک سیاسی ناولٹ ''وارننگ'' بھی لکھ رہے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد یہ مسودہ بھی مفقود الخبر ہو گیا۔

اس وقت وفاق اور صوبے میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1970ء کے انتخابات کی بنیاد پر عنانِ اقتدار سنبھالی تھی۔ تقریباً روزانہ ہی پیپلز پارٹی کے ایک دو صوبائی وزراء جنگی قیدیوں کے استقبال کے لیے سرحد پر موجود ہوتے تھے۔

لاہور کی ڈیوٹی انجام دے کر واپس راولپنڈی پہنچا تو اٹک قلعہ میں جاری فیلڈ کورٹ مارشل کی

مسٹر! یہ کیا کہہ رہے تھے آپ؟ ایک کیپٹن آرمی چیف اور صدرِ مملکت کو کہہ رہا ہے کہ سر! میرے لائق کوئی خدمت؟ تم جانتے ہو کس سے بات کر رہے تھے، صدرِ پاکستان، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور آرمی چیف سے، ہوش میں تو ہو؟

Scanned with CamScanner

ایک بات یاد رکھنا کہ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل سردار ایف ایس لودھی اپنے نام کے انگریزی ہجوں کے بارے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں، میں نے کئی مرتبہ بہت مشکل سے اپنی گردن بچائی ہے

سرکاری کوریج کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ دو صحافی اے پی پی کے محمد عزیز صاحب اور پی پی آئی کے رمضان عادل صاحب مستقل اٹک قلعہ میں قیام پذیر تھے تاہم آئی ایس پی آر کا ایک افسر صبح اٹک قلعہ جاتا تھا، کورٹ مارشل کی کارروائی کے بعد دونوں صحافی حضرات پریس رپورٹس تیار کرتے تھے جنہیں عدالتی نوک پلک پر کھنے کے لئے کسی ایک کورٹ ممبر کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ ممبر کی منظوری کے بعد یہ پریس ریلیز آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر فضل الرحمٰن دیکھتے تھے، سب سے آخر میں پریس رپورٹس پرنسپل انفارمیشن آفیسر (پی آئی او) کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ دو روز کے وقفے کے بعد یہ رپورٹس جاری ہوتی تھیں۔ شنید تھی کہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو متن کی منظوری دیتے تھے۔

ایک روز میں تاخیر سے اے پی پی اور پی پی آئی کے نمائندگان کی رپورٹس لے کر پی آئی او افضال زیدی صاحب کے دفتر پہنچا تو وہ تاخیر سے آنے پر سخت برہم ہوگئے، کہنے لگے: ''پی ایم آفس سے کئی مرتبہ کال آئی ہیں۔ رپورٹس کا انتظار ہو رہا ہے''۔ انہوں نے شدت جذبات میں کچھ نہ کچھ اگل دیا۔ اب آیئے فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کی جانب۔ یہ کارروائی اٹک قلعے میں جاری تھی جہاں گرفتار شدہ فوجی افسر مقید تھے۔ ان میں بریگیڈیئر ایف بی علی، بریگیڈیئر عتیق احمد، بریگیڈیئر واجد علی شاہ، کرنل علیم آفریدی، میجر طارق پرویز، میجر نادر پرویز، میجر اشتیاق آصف، کیپٹن اظہر سمیت 25 کے لگ بھگ افسر تھے۔ یہ بھٹو صاحب کی حکومت کے خلاف بغاوت کی منصوبہ بندی کے الزام میں کورٹ مارشل کا سامنا کر رہے تھے۔ چند چوٹی کے وکلاء جن میں منظور قادر، بیرسٹر اعتزاز احسن اور ایس ایم ظفر بھی شامل تھے وکلاء صفائی تھے۔ فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کے سربراہ میجر جنرل محمد ضیاء الحق (بعد میں چیف آف آرمی سٹاف اور صدر پاکستان) تھے، دیگر ممبران میں بریگیڈیئر جہانداد، بریگیڈیئر رحمت علی شاہ بخاری، کرنل محمد اقبال اور میجر مظفر حسین عثمانی تھے۔ کارروائی کے دوران عسکری انداز میں ٹی بریک کا وقفہ ہوتا اور بعد میں لنچ آفیسر میس میں تھا جس میں میجر جنرل محمد ضیاء الحق اور دیگر کورٹ ممبران اور کبھی کبھار بیرسٹر اعتزاز احسن بھی موجود ہوتے تھے۔ دونوں صحافی حضرات کے ہمراہ میں بھی ''لنچ گروپ'' کا باقاعدہ ممبر تھا۔ یہ فری لنچ نہیں تھا۔ ہر مہینے بل کی ادائیگی ڈائننگ ممبر کی ذمہ داری تھی۔ صحافی حضرات کے بل کی ادائیگی آئی ایس پی آر کے ذمہ تھی۔ اٹک سازش کیس میں ملوث فوجی افسران، کورٹ ممبران اور صحافی حضرات کے لئے آئی ایس پی آر کا افسر راولپنڈی سے رابطہ کا قابل اعتماد ذریعہ تھا۔ لنچ ٹیبل پر میجر جنرل محمد ضیاء الحق بے تکلفانہ گفتگو کے باعث سب کا دل موہ لیتے تھے۔ ایک روز میں میس کے برآمدے میں کھڑا تھا تو کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے: ''راولپنڈی کی

Scanned with CamScanner

ایک ڈیوٹی ہے، اگر ناگوار نہ گزرے تو انجام دے دیں''۔ ظاہر ہے ایک لیفٹین کے لئے ناگواری کا آپشن نہیں تھا۔ فرمایا کہ ''مال روڈ راولپنڈی کے پاس میری وردی موجود ہے، وہ آپ کل اٹک فورٹ آتے ہوئے لے آئیں''۔ میں نے رائٹ سر کہا اور انگشت شہادت پر دھاگہ باندھ لیا کہ کہیں واپسی پر جیپ میں سوتا نہ رہ جاؤں اور ''ٹو سٹار وردی'' راولپنڈی ہی میں رہ جائے۔ بہر حال شام ہی کو اسماعیل ٹیلرز سے وردی حاصل کر لی۔ اگلے روز علی الصبح وردی دونوں ہاتھوں سے تھام کر پہلے دفتر پہنچا اور پھر سرکاری جیپ میں اٹک قلعہ روانہ ہو گیا۔ لیفٹین کی قسمت میں دوسری جنگ کی دھتکاری ہوئی جیپ تھی جس میں ایک لیفٹین ایک میجر جنرل کی وردی تھامے سوار تھا۔ جیپ جگہ جگہ رکتی، کھانستی اور ڈولتی ہوئی اٹک قلعہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوئی۔ میں نے سب سے پہلے وردی کو میجر جنرل محمد ضیاء الحق کے روم میں پہنچایا، جہاں ان کا اردلی مزید پذیرائی کے لئے موجود تھا۔ یہ ڈیوٹی انجام دینے کے بعد کورٹ روم میں داخل ہوا تو مقدمے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ پریس کے لئے تین کرسیاں وکیل استغاثہ کے ساتھ تھیں۔ ملزم لیفٹیننٹ اظہر نے ایک روز سیاہ مارکر سے Press سے پہلے De لکھ کر اسے Depress بنا دیا جو مقدمے کے اختتام تک جوں کا توں رہا۔ لیفٹیننٹ اظہر سابق کور کمانڈر اور سابق گورنر لیفٹیننٹ جنرل محمد اظہر خان کے صاحبزادے تھے۔ کامیاب وردی مشن کے بعد اپنی نشست پر بیٹھا ہی تھا کہ میجر جنرل محمد ضیاء الحق سے آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے سر جھکا کر کامیابی کا اشارہ دے دیا۔ لنچ ٹیبل پر انہوں نے شکریے کے انبار لگا دیئے۔ اب ہمیں بھی ''بڑوں'' کی گفتگو میں مصرع ''طرح'' اٹھانے اور کبھی ''مقطع'' ٹھونسنے کی ہمت ہونے لگی۔ میجر جنرل محمد ضیاء الحق اپنے مخاطب کو ہمیشہ نام کے ساتھ ''صاحب'' کہہ کر گفتگو کا آغاز کرتے۔

پریس رپورٹس کا متن اکثر بریگیڈیئر جہانداد خان چیک کیا کرتے تھے۔ یہ بعد میں لیفٹیننٹ جنرل کے رینک تک پہنچے۔ کور کمانڈر راولپنڈی اور گورنر سندھ بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد راولپنڈی میں شفا آئی ہسپتال کی بنیاد رکھی اور خود کو اس کے لئے وقف کر دیا۔ یہ ہسپتال آج آنکھوں کے امراض کا مثالی شفاخانہ ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل جہانداد کی قبر ہسپتال کے احاطے میں موجود ہے۔ ایک اور بریگیڈیئر رحمت علی شاہ بخاری تھے، کبھی کبھار وہ بھی متن دیکھتے تھے۔ طویل القامت تھے۔ ایک روز دونوں رپورٹس پڑھ رہے تھے کہ روشنی کے لئے لیمپ آن کرنا چاہا تو کرنٹ محسوس ہوا۔ انہوں نے شدت سے آواز بلند کی جسے سن کر باہر گارڈ اندر آ گیا۔ قریب تھا کہ مجھ پر حملہ آور ہوتا کہ بریگیڈیئر بخاری نے اشارے سے لیمپ کی طرف اشارہ کیا۔ اب الیکٹریشن کی تلاش شروع ہوئی۔ انہوں نے

جنرل محمد ضیاء الحق تھے جنہوں نے دہلی میں راجیو گاندھی کو حملے کی صورت میں تا قیامت بربادی کا مژدہ سنا دیا تھا یوں حملے کی کیفیت میں کمی آ گئی

Scanned with CamScanner

بیرونی محاذ پر بھارت جنرل محمد ضیاء الحق سے سب سے زیادہ خائف تھا، شاید ان کے پاس پاک افواج کی تیاری کے حوالے سے رپورٹس موجود ہوں گی

رپورٹس میری طرف پھینکیں اور میں چپ چاپ جیپ کی طرف بھاگا۔ بریگیڈیئر بخاری میجر جنرل کے رینک تک پہنچے۔ دوران سروس بہاولپور میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ایک اور ممبر میجر مظفر حسین عثمانی لیفٹیننٹ جنرل کے رینک میں کور کمانڈر کراچی تعینات رہے۔ (ان کا حال ہی میں انتقال ہوا)۔

میجر جنرل محمد ضیاء الحق سے اٹک سازش کیس کے زمانے کی علیک سلیک تاحیات قائم رہی۔ اس حوالے سے آگے مزید ذکر آئے گا۔ بہر حال فیلڈ جنرل کورٹ مارشل نے اپنے فیصلے میں ایک ملزم میجر طارق پرویز کو بری کیا اور دیگر تمام ملزم افسران کو مختلف المیعاد سزائیں سنا دیں۔ میجر طارق پرویز لیفٹیننٹ جنرل کے رینک سے ریٹائر ہوئے۔ کور کمانڈر کوئٹہ رہے، سزا یافتہ اکثر افسر جنگ آزما تھے۔ فوج میں ان سے منسوب واقعات میں بہادری، دلیری اور دشمن کو ٹھکانے لگانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ متعدد کو وار میڈل بھی ملے ہوئے تھے۔ یہ افسر مبینہ طور پر سمجھتے تھے کہ دسمبر 1971ء کی ہزیمت کے اصل کردار اور ذمہ دار سیاستدان تھے جنہوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فوج کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کا کردار مجرمانہ ہے۔ انہوں نے مارچ 1971ء میں قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس کا بائیکاٹ کر کے مشرقی پاکستان میں بھارتی ایجنٹوں اور علیحدگی پسندوں کو سیاسی لحاظ سے ایک بنیاد فراہم کی تھی جس کے بعد کھل کر بنگالی مخالفین، اردو پنجابی بولنے والوں اور وفاقی اداروں کے اہلکاروں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ عورتوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ملزم افسروں کے خیال میں سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو بھی شیخ مجیب الرحمٰن کی طرح پابند سلاسل کر کے نئے سرے سے انتخابات کرانے چاہئیں تھے۔ یہ گروپ جنرل آغا محمد یحییٰ خان اور ان کے ساتھیوں کے بھی سخت خلاف تھا۔ مقدمے کا لب لباب یہ تھا کہ یہ افسر انقلابی حکومت قائم کر کے من مانی کرنا چاہتے تھے۔

اٹک سازش کیس کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو کچھ عرصہ راولپنڈی ہی میں سرکاری اور غیر سرکاری مٹر گشت میں صرف ہوا۔ اس دوران بلوچستان میں آرمی کی پیشہ وارانہ اور اندرونی سلامتی سے متعلق سرگرمیوں کی معمول کی تشہیر کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ آئی ایس پی آر میں ''لیفٹین'' کو ڈیڑھ برس سے زائد عرصہ ہو گیا تھا۔ ایک روز معلوم ہوا کہ مجھے کیپٹن کے رینک پر ترقی کے لیے جی۔ ایچ۔ کیو کے متعلقہ شعبے سے خط کتابت شروع کر دی گئی ہے۔ کیپٹن کا رینک ملتے ہی لاہور یا کوئٹہ میں سے کسی ایک شہر میں تعیناتی کی جائے گی۔ لاہور کا ذکر آتے ہی بے اختیار ''آمین'' زبان پر جاری ہو جاتا تھا۔ قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کوئٹہ کے لئے پہلے میجر محمد غازی الدین کا نام طے شدہ تھا تاہم لاہور کی صحافتی اہمیت کے پیش نظر

Scanned with CamScanner

انہیں لاہور اور مجھے کوئٹہ تعینات کر دیا گیا۔ سب سے اہم ذمہ داری کوئٹہ میں آئی ایس پی آر کا مستقل آفس قائم کرنا تھا۔

اس سے قبل راولپنڈی سے افسر اور دیگر اہلکار عارضی ڈیوٹی پر فرائض ادا کرتے تھے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان کی صوبائی حکومت برطرف کر دی تھی۔ وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل سڑک پر تھے اور پورے بلوچستان میں پیپلز پارٹی کے بانی کی نافذ کردہ ''جمہوریت'' کا راج تھا۔ مری اور مینگل قبائل سراپا احتجاج تھے۔ اس مرحلے پر متعدد بلوچ اور پختون رہنماؤں کو گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اندرونی سلامتی کی بحالی کے لئے پاک فوج کو مناسب اقدامات انجام دینے کی ہدایت کی۔ کراچی کور کا ٹیکٹیکل ہیڈ کوارٹر کوئٹہ منتقل کر دیا گیا۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اکبر خان اس آپریشن کی قیادت کر رہے تھے۔

میرے کوئٹہ پہنچتے ہی ابلاغی مصروفیات کا انبار تھا۔ ''نفسیاتی جنگ'' کے دو ماہر افسر بھی ہمارے دفتر سے بالواسطہ منسلک کر دیئے گئے۔ ایک رینک سینئر تھے لہٰذا انہیں بھی ''سر، سر'' کہنا پڑتا تھا۔ بہر حال بلوچستان میں آئی ایس پی آر افسر کی حیثیت سے مری، بگٹی اور مینگل قبائل کے زیر نگیں علاقے دیکھے اور وہاں کے عوام سے ملنے کے وسیع مواقع حاصل ہوئے۔ شاید عام حالات میں یہ سہولت حاصل نہ ہوتی۔ فوجی دستے دور دراز علاقوں میں نامساعد حالات کے باوجود سرگرم تھے۔ فراریوں اور شورش میں ملوث افراد کی سرکوبی کے ساتھ ساتھ ترقیاتی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ سڑکیں، سکول، شفا خانے اور تھانے ناپید تھے۔ نامساعد حالات کے باوجود فوج کے افسر اور جوان دن رات ایک کئے ہوئے تھے۔ آرمی کی کور آف انجینئرز اور میڈیکل کور نے مثالی لگن اور ایثار کے ساتھ اپنے فرائض ادا کئے۔ مری ایریا خاص طور سے دشوار گزار مقامات اور سخت کوش افراد پر مشتمل ہے۔ بعض مقامات پر فوجی دستوں اور سول آرمرڈ سروسز کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تاہم ریاست سے کون کب تک لڑ سکتا ہے، سیکڑوں کی تعداد میں شورش پسند گرفتار ہوئے۔ اکثر ''حالات حاضرہ'' سے قطعاً نابلد اپنے سردار کے ''غلام'' تھے۔ جو حکم ملا سر تسلیم خم کر دیا۔ میں بھی اپنی ٹیم کے ساتھ ''میدان عمل'' کے قریب قریب ہی تھا۔ مری علاقے کا اہم قصبہ ''کوہلو'' بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تھا۔ بریگیڈیئر محمد عثمان حسن (ستارہ جرات) کمان کر رہے تھے۔ بریگیڈیئر میجر (بی ایم) میجر سلیم حیدر اور سٹاف افسر تھری کیپٹن ضرار عظیم تھے۔ برسبیل تذکرہ یہ بھی سن لیجئے کہ بعد ازاں میجر سلیم حیدر اور کیپٹن ضرار عظیم دونوں لیفٹیننٹ جنرل کے رینک پر ریٹائر ہوئے۔ کمانڈر بریگیڈیئر محمد عثمان حسن ایک دلیر، جفاکش اور پیشہ وارانہ دیانت کے حامل افسر تھے۔ میں سب سے جونیئر ''محو حیرت''

ضیاء الحق نے متعدد بار پاک افواج کی تربیتی مشقوں کے معائنہ کے بعد خطاب کرتے ہوئے کہا: ''ہم نے سقوط ڈھاکہ کا بدلہ لینا ہے، بھارت کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے گا جو اس نے ہمارے ساتھ مشرقی پاکستان میں کیا''

Scanned with CamScanner

جنرل آصف نواز کو پروٹوکول سے بھی ''عقیدت'' نہیں تھی، گھر سے صرف ایک سٹاف کار، ساتھ ملٹری پولیس کی جیپ اور کوئی ہٹو بچو کی صدا نہیں ہوتی تھی، راستے میں تمام ٹریفک سگنلز پر کار رکتی تھی

ایک چھوٹے سے خیمے میں ''مقید'' تھا۔ اکیلا زیادہ دُور جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کمانڈر جیپ میں علاقے کے دورے پر اپنے ہمراہ لے جاتے تھے۔ فوٹوگرافر اور کیمرہ مین اپنا کام کرتے اور مجھے مقامی افراد سے بات چیت کا موقع مل جاتا تھا۔ رات گئے بریفنگ کا سیشن گرین ٹی کے ساتھ جاری رہتا تھا۔ اب میں نے بھی گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ بریگیڈیئر کمانڈر کے پاس علاقے کے بارے میں وسیع معلومات تھیں۔ مقامی افراد بھی ملنے آتے رہتے تھے۔ ایک روز میں نے کمانڈر سے کہا کہ آپ روزانہ ڈائری لکھا کریں۔ اردو میں لکھیں تو اور بھی بہتر رہے گا۔ کہنے لگے ،لکھنا نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے، آپ ہر ہفتے گھر خط لکھتے ہیں۔ انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا وہ لکھنا بہت ضروری ہے، ورنہ تم سمجھتے ہو۔'' میں نے کہا نہیں سر! میں غیر شادی شدہ ہوں''۔ یوں بات چیت ختم ہوگئی۔ میں نے اٹھتے ہوئے کمانڈر کو تجویز دی کہ سر! مناسب ہو گا کہ اگر آپ روزانہ خط کے انداز میں ڈائری لکھنا شروع کر دیں۔ انہیں یہ تجویز پسند آئی۔ بریگیڈیئر عثمان حسن نے تقریباً روزانہ واقعات قلمبند کرنا شروع کر دیئے۔ آپریشن مکمل ہونے کے بعد یہ ڈائری ایک کتاب بعنوان '' بلوچستان۔ ماضی، حال اور مستقبل'' کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو خاصی پذیرائی ملی۔ اخبارات اور جرائد میں تبصرے بھی شائع ہوئے۔ اکثر مبصرین کے نزدیک اس کتاب کی بدولت بلوچستان کے ''شورش زدہ'' علاقوں کے حالات اور واقعات سے براہ راست آگاہی ہوئی۔ کمانڈر کی ڈائری لکھنے کے اوقات غیر متوقع ہوتے تھے۔ شاعر کی مانند جب مصرع ذہن میں آیا لکھنے بیٹھ گئے۔ یہ صورتحال آپریشن میں سرگرم بریگیڈ کے سٹاف آفیسر کے لئے ناقابل قبول تھی۔ میجر سلیم حیدر اور کیپٹن ضرار عظیم تمام تر شفقت اور ملنسار رویے کے باوجود کبھی کبھار مجھ پر ناراض ہو جاتے کہ تم نے کمانڈر کو کس کام پر لگا دیا ہے۔ اچانک ایک رجسٹر کھول کر لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ہم فائل پر دستخط کے انتظار میں سوکھ رہے ہوتے ہیں۔ میرا اپنے سینئرز کو ایک ہی جواب تھا کہ سر! تاریخ مرتب ہورہی ہے۔ اطمینان رکھیں۔

یاد آیا! بریگیڈیئر عثمان حسن ریٹائر ہونے کے بعد بلوچستان میں صوبائی سیکرٹری کے عہدہ پر بھی تعینات رہے اور انہوں نے مزید دو کتب بھی مرتب کیں۔ بلوچستان کے مسائل، ترقیاتی منصوبہ بندی اور دیگر معاملات پر انہیں خاصا عبور تھا۔ دراصل بلوچستان کا شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہو جسے انہوں نے بچشم خود ملاحظہ نہ کیا ہو۔ یہ معلومات وفاق کے لیے بہت بڑا اثاثہ تھیں۔ مری ایریا میں حالات بہتر ہوئے تو میں دوبارہ کوئٹہ واپس آ گیا۔ اس دوران ہفت روزہ ''ہلال'' راولپنڈی میں ''بلوچستان نامہ'' اور '' براستہ بلوچستان'' کے عنوان سے متعدد مضامین تحریر کیے۔

Scanned with CamScanner

اکتوبر 1975ء میں والدین نے مجھے لاہور طلب فرمایا۔ چندروز کے بعد اپنی بارات کے ساتھ لطیف آباد نمبر 3 حیدر آباد کی جانب گامزن تھا۔ میری اہلیہ والدہ گرامی کے بڑے بھائی کی دختر نیک اختر ہیں۔ اہلیہ کے ایک بھائی طویل عرصہ تک مینٹل ہسپتال حیدر آباد (المشہور پاگل خانہ گرو بندر) میں میڈیکل افسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ ہم بھی بچپن اور لڑکپن میں تعطیلات گزارنے ''گرو بندر'' آیا کرتے تھے جہاں ڈاکٹر صاحب کے بنگلے کے اردگرد وسیع وعریض میدان کھیل کود کے لئے موزوں تھے۔ ڈاکٹرز کالونی سے آگے وارڈز تھے جہاں ذہنی امراض میں مبتلا افراد کو بیماری کی سنگینی کے مطابق مختلف وارڈز میں رکھا گیا تھا۔ ایک وی آئی پی وارڈ بھی تھا۔ یہ اعلیٰ خاندانوں اور بااثر افراد کے لئے مخصوص تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک بھاری بھرکم شخصیت دس پندرہ افراد کے جلو میں چہل قدمی کرتے ہوئے دکھائی دیتی تھی۔ ہم نے بھائی ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک پیر صاحب ہیں۔ نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ پاگل خانے میں زیر علاج ہیں۔ مریدون میں ''زیارت'' کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ میری اہلیہ کے ایک اور بڑے بھائی نے نیشنل ہسپتال لطیف آباد نمبر 3 کے قریب ہی گھر خرید لیا تھا۔ میری بارات اسی گھر میں گئی۔ لاہور واپسی ٹرین ہی سے تھی۔ شادی کے لئے بمشکل پندرہ روز کی چھٹی ملی تھی۔ یہ دن شادی کے شور شرابے ہی میں گزر گئے۔ اس افراتفری میں کوئٹہ واپسی اور وہاں سے دوروز کے وقفے کے بعد دوبارہ اندرونی سلامتی کے فرائض انجام دینے والے فوجی دستوں کے ساتھ اگلے مورچوں پر خبر اور تصویر کے لئے سرگرداں ہو گئے۔ عجب صورتحال کا سامنا تھا۔ ایک سیاستدان کے فیصلے کے مطابق قومی فوج اور دوسرے سیاستدان کے حکم پر ''شورش پسندوں'' نے ایک دوسرے کو نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ پاکستان کی جغرافیائی حدود میں برپا تھا۔ دکھ کی بات ہے کہ گرفتار ہونے والے پچانوے فیصد شورش پسند اردگرد کے ماحول ہی سے بے خبر تھے۔ سردار ہی ان کے لیے زمین وآسمان تھا۔ بلوچستان کے یہ علاقے اگر پاکستان میں شامل تھے تو انہیں ترقی کے ان ثمرات سے بہرہ مند ہونا چاہیے تھا جس سے دیگر علاقے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ بدقسمتی سے اس حوالے سے سیاسی عزم ناپید نظر آیا۔ مقامی سیاسی قائدین ایک دوسرے کے درپے تھے۔ مری اور مینگل علاقے میں آپریشن شروع ہوا تو نواب اکبر بگٹی نے بھٹو صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے تمام اقدامات کی حمایت کر دی۔ مجھے یاد ہے کہ فوجی آپریشن کے حق میں اکبر بگٹی صاحب نے کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ میں ولولہ انگیز خطاب کیا۔ بھٹو صاحب ہر لحاظ سے بلاشرکت غیرے پاکستان کے حکمران تھے۔ پیپلز پارٹی ذاتی جماعت تھی جس میں

اندرون سندھ سے تعلق رکھنے والے قوم پرست سندھی بعض اوقات پیپلز پارٹی کے کندھے پر بندوق رکھ کر مخالفین کو زک پہنچاتے تھے

Scanned with CamScanner

لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز نے دفتر طلب کر کے کہا:

''اس واقعہ کی پی آر او! کوئی خبر، تصویر وغیرہ اخبار میں نہیں آنی چاہیے''

کسی کو اختلاف رائے کی جرات نہیں تھی۔ رہی سہی کسر جنرل ٹکا خان کی تعیناتی نے مکمل کر دی تھی۔ بھٹو صاحب نے پاک آرمی کے آخری کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کو ''غیر روایتی'' انداز میں رخصت کر کے جنرل ٹکا خان کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کر دیا تھا۔ موصوف اس سے قبل مشرقی پاکستان میں بھٹو صاحب کے ''سیاسی عزم'' کی ''عسکری انداز'' میں تکمیل کر چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جنرل ٹکا خان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ راولپنڈی سے الیکشن لڑا اور ناکام ہوئے۔ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔ فوج کے سابق سربراہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے موچی دروازہ لاہور کے باہر پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے درمیان ''حواس باختہ'' دیکھا۔ جنرل ٹکا خان کی ریٹائرمنٹ کے دن قریب آ رہے تھے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ایک اور ٹکا خان کی تلاش درپیش تھی۔ اس حوالے سے چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ کئی نام گردش میں تھے تاہم ویٹو بھٹو صاحب کے پاس تھا۔ چند روز شش و پنج میں گزرے۔ ایک دن کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اکبر خان اور دیگر افسران ڈنر کے بعد ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف تھے۔ کور کمانڈر نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ہاں بھائی، پی آر او، پریس کی کیا خبر ہے؟'' میں نے بے ساختہ جواب دیا کہ ''سر! دعا کریں نیا آرمی چیف فوج ہی سے ہو''۔ اس بات پر خاموشی چھائی گئی۔ پھر ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

''کیا مطلب؟'' کئی آوازیں آئیں؟۔ میں نے کہا: ''بھٹو صاحب سے غیر معمولی فیصلہ متوقع ہے۔ وہ خود آرمی چیف بن کر کور کمانڈرز کے ذریعے فوج کو پیشہ وارانہ طور سے مصروف رکھ سکتے ہیں''۔ سب نے میری بات کو قہقہوں میں اڑا دیا۔

جنگ 1971ء کے بعد فوج کے بارے میں پیپلز پارٹی کی جانب سے نازیبا پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری تھا۔ جنرل ٹکا خان نے اس رویے کو نظر انداز کئے رکھا۔ مشرقی پاکستان کے حوالے سے بے سروپا باتیں ''فیڈ'' کی جا رہی تھیں۔ دراصل بھٹو صاحب کی حکمت عملی یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں ہزیمت کا تمام تر بوجھ فوج ہی پر رہے اور جذباتی قوم کے سامنے پلٹن میدان میں سرنڈر کی تصاویر اور فلمیں پیش کر کر کے سیاسی رہنماؤں کے براہ راست ملوث ہونے کو اذہان سے نکال دیا جائے۔

بہر حال ایک روز کور کمانڈر ملتان لیفٹیننٹ جنرل محمد ضیاء الحق کی جنرل ٹکا خان کے بعد آرمی چیف مقرر ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ بھٹو صاحب نے تقریباً آٹھ لیفٹیننٹ جنرلز کو نظر انداز کر کے جنرل ضیاء الحق کو اس اہم عسکری منصب کے لئے منتخب کر لیا۔ کوئٹہ کے ''کور ٹیکٹیکل ہیڈ کوارٹرز'' میں سناٹا تھا۔ تقرر غیر متوقع تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان کو آرمی چیف تعینات ہونے کی بہت امید تھی۔ شاید انہیں جنرل ٹکا خان نے بھی امید دلائی تھی۔ اس وقت کے کور کمانڈر پشاور لیفٹیننٹ جنرل عبد

Scanned with CamScanner

المجید ملک نے ریٹائرمنٹ کے بعد لکھی گئی کتاب ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' میں نئے آرمی چیف کے تقرر کے بارے میں ذاتی معلومات درج کی ہیں۔ ان کے مطابق وزیراعظم بھٹو نے متعدد بار کہا کہ وہ انہیں آرمی چیف بنانا چاہتے ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل عبدالمجید ملک رقمطراز ہیں کہ انہیں بھی لیفٹیننٹ جنرل محمد ضیاء الحق کی ترقی اور تقرر پر حیرت ہوئی۔ نئے آرمی چیف کے تقرر کے اعلان کے بعد لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان نے فوری طور پر ریٹائرمنٹ کے لئے درخواست دے دی جو منظور کر لی گئی۔ کور میں الوداعی تقریب ہوئی۔ ایک ہیلی کاپٹر میں رخصت ہونے والے کور کمانڈر اپنے زیر کمان افسروں اور جوانوں کو ''خدا حافظ'' کہنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں بھی اپنی ٹیم کے ہمراہ موجود تھا۔ روایتی تقاریر میں نئے آرمی چیف کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے لیفٹیننٹ جنرل محمد اکبر خان کراچی واپس پہنچ گئے جہاں اختتامی الوداعی تقریب کا اہتمام تھا۔ قائمقام کور کمانڈر میجر جنرل جہانزیب ارباب کو مقرر کر دیا گیا۔

جنرل ہیڈ کوارٹرز میں آرمی چیف کا منصب سنبھالنے کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق پہلے دورے پر کوئٹہ تشریف لائے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اٹک قلعے میں فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کے سربراہ میجر جنرل محمد ضیاء الحق کے ذہن میں لیفٹیننٹ صولت رضا کی پہچان موجود ہے۔

کوئٹہ ایئرپورٹ پر تازہ دم آرمی چیف جہاز سے اترے، سینئر آرمی افسروں کی استقبالیہ قطار جہاز کی سیڑھیوں کے ساتھ موجود تھی۔ ڈیوٹی پر موجود جونیئر افسر ایک فاصلے پر کھڑے تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق سینئر افسروں سے مصافحہ کر کے جونہی فارغ ہوئے تو ان کی نظر جونیئر افسروں کی جانب اٹھی اور مجھے فاصلے سے ہی پہچان لیا۔ ''صولت صاحب، آپ کہاں؟'' یہ آواز غیر متوقع تھی۔ قائمقام کور کمانڈر نے کہا کہ سر! یہ میرا پی آر او ہے۔ آئی ایس پی آر افسر ہے۔ اب جنرل ضیاء الحق کی باری تھی، انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹک قلعے کی یادیں تازہ کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنے سٹاف افسر سے کہا کہ ''بلوچستان میں قیام کے دوران کچھ وقت صولت صاحب کے لیے رکھنا ہے۔ میں نے گپ شپ کرنی ہے''۔ آرمی چیف کے یہ ارشادات میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے۔ دفتر پہنچا تو دو تین صاحبان میرے دفتر کی تزئین و آرائش کے حکم میں مبتلا تھے۔ یہ دفتر ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے سب سے زیادہ ''نظر انداز'' حصے میں واقع تھا۔ جس کے ایک حصے میں بلیک اینڈ وائٹ تصاویر بنانے کے لیے ڈارک روم بھی تھا۔ چند گھنٹوں میں نیا قالین، فرنیچر، رنگ اور روغن اور معلوم نہیں کیا کیا گیا۔ دیواروں پر جہاں مستقل داغ دھبے تھے وہاں پر وال پیپرز چسپاں کر دیئے گئے۔ معاملہ کیا ہے؟ ایک جوان نے بتایا کہ سر! نئے آرمی چیف آپ کے دفتر

جنرل آصف نواز نے ذرا تلخ اونچی آواز میں کہا

''پی آر او! یہ سب کیا ہے؟'' میرا جواب واضح تھا کہ

''سر! یہ خبر میں نے تصویروں کے ساتھ خود پہنچائی ہے''

Scanned with CamScanner

میں نے جواب دیا: تشدد اور لاقانونیت میں ملوث افراد اور گروہوں کی پردہ پوشی بھی شریک جرم ہونے کے مترادف ہوگی

میں آرہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ چیف کا ملاقات کا حکم دفتر کے دورے کی افواہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ راولپنڈی آفس سے بھی کالز موصول ہو رہی تھیں۔ سب پوچھ رہے تھے کہ آرمی چیف نے اور کیا بات کی۔ شروع سے بتاؤ؟ کیا ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ ''عزت سادات'' بحال ہوگئی۔ بلوچستان کے حوالے سے واقعات بہت ہیں۔ آرمی چیف کی تبدیلی کے باوجود آپریشن کی کیفیت برقرار تھی۔ کوئٹہ میں خاص سرگرمی نہیں تھی۔ البتہ رات آٹھ اور نو بجے کے درمیانی حصے میں ایک دو مرتبہ بم دھماکہ ضروری ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ مشکوک افراد پکڑے بھی گئے لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ بلوچ رہنما اس کارستانی کی ذمہ داری افغانستان سے آنے والے ''غیر پاکستانی'' عناصر پر ڈالتے تھے۔ اس کے برعکس پختون قائدین کا اصرار تھا کہ بلوچ قوم پرست ہیں جو پہاڑوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ کوئٹہ میں ایک خاموش قبیلہ ہزارہ قوم کا بھی ہے جو اپنے مخصوص رسم ورواج اور نسلی شناخت کے باعث ایک الگ تھلگ مقام رکھتا ہے۔ یہ میں اپنے زمانے 70 ویں اور 80 ویں دہائی کی بات کر رہا ہوں۔ اب تو حالات بہت تبدیل ہو گئے ہیں۔ میرے نزدیک کراچی کے بعد کوئٹہ سب سے زیادہ کثیر نسلی شہر ہے۔ کم از کم دس مختلف نسلی پس منظر کے حامل خاندان برسوں سے مقیم ہیں۔ سیاسی میدان میں مقابلہ بھی بلوچ اور پختون مفادات کی رسہ کشی ہے۔ البتہ فلاحی اقدامات کے ہونے یا نہ ہونے سے ہر نسل کا فرد اور خاندان متاثر ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ جو ذہن سے کبھی محو نہ ہو سکا وہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل محمد ضیاء الحق کے مابین کوئٹہ کی ایک آفیسر میس میں دلچسپ مکالمہ تھا۔ بھٹو صاحب بلوچستان کے دورے پر تھے۔ آرمی چیف جنرل محمد ضیاء الحق اور چیف آف جنرل سٹاف جنرل عبداللہ ملک بھی ان کے ہمراہ تھے۔ میس میں لنچ تھا جس میں گریژن کے کچھ اور افسر بھی تھے۔ بھٹو صاحب اپنے مخصوص انداز میں تشریف لائے۔ نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر جنرل (ر) ٹکا خان بھی ہمراہ تھے۔ ابھی لنچ کی باضابطہ کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی۔ جوان افسر بھٹو صاحب کے گرد گھیرا ڈالے ان کی قادر الکلامی سے مستفید ہو رہے تھے کہ بھٹو صاحب کے آبدار نے ''مشروب مغرب'' سے بھرا گلاس ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے ارد گرد دیکھا، ہر طرف خاموشی تھی۔ کسی نے آواز لگائی کہ آرمی میس میں ''نوش جاں'' کرنے پر پابندی ہے۔ ''کس نے لگائی ہے؟'' بھٹو صاحب کی گرج سنائی دی۔ ''ویئر از ضیاء؟''۔ ضیاء کہاں ہے؟۔ جنرل محمد ضیاء الحق کچھ فاصلے پر مہمانوں کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔ انہیں اطلاع دی گئی کہ وزیراعظم یاد فرما رہے ہیں۔ وہ فوراً حاضر ہو گئے۔ جی سر! بھٹو صاحب نے پابندی کے بارے میں دریافت کیا تو بولے کہ میس میں ''نوش جاں'' کر

Scanned with CamScanner

نے پر پابندی جنرل ٹکا خان کے دور سے ہے۔ بھٹو صاحب نے اپنا گلاس لہراتے ہوئے کہا: ''میں تو پی رہا ہوں''۔ اس موقع پر جنرل ضیاء الحق نے وزیراعظم کو تاریخی جملہ کہا کہ '' Sir!You are above the law''(جناب آپ قانون سے بالاتر ہیں۔) یہ جملہ سن کر بھٹو صاحب پھولے نہیں سما رہے تھے، سب نے قہقہہ لگایا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

بڑے عہدوں پر متمکن شخصیات کی گفتگو، بدنی بولی اور نشست و برخاست میں خیر اور شر کے پہلو موجود رہتے ہیں۔ دیکھنے اور سننے والوں کیلئے نصیحت، وصیت اور عبرت کا سامان ہوتے ہیں۔ کاش بروقت غور کرلیا جائے!

کوئٹہ میں سلسلہ ہائے روز وشب میں اتار چڑھاؤ معمول تھا۔ سردیاں خاص طور سے کڑا امتحان تھیں۔ کوئٹہ قدرتی گیس سے محروم تھا۔ لہذا پتھر کوئلہ سے کام چل رہا تھا۔ سیاسی سطح پر کوئی خاص ہلچل نہیں تھی کہ اچانک سات جنوری 1977ء کو وزیراعظم بھٹو نے اعلان کیا کہ سات مارچ 77ء کو عام انتخابات ہوں گے۔ دس مارچ 77ء کو قومی اسمبلی تحلیل کر دی گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی مخالف جماعتوں نے مولانا مفتی محمود کی قیادت میں نو جماعتوں نے انتخابی اتحاد قائم کرلیا اور ''ہل'' کے انتخابی نشان کے ساتھ حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ پیپلز پارٹی کا نشان حسب سابق تلوار تھا۔ وطن عزیز میں ایک بار پھر معرکہ حق و باطل برپا ہوا۔ سات مارچ 77ء کو انتخابات منعقد ہوئے۔ سرکاری اعلان کے مطابق پاکستان پیپلز پارٹی نے 155 اور پاکستان قومی اتحاد نے 35 نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ کل نشستیں 200 تھیں۔ پاکستان قومی اتحاد نے نتائج تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بھٹو حکومت کے خلاف ملک گیر تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ کوئٹہ اور بلوچستان کے دیگر شہروں، قصبات وغیرہ میں بھی جلسے جلوس اور ریلیاں نکلنے لگیں۔ ان علاقوں میں جمعیت علمائے اسلام کے رہنما اور کارکن زیادہ سرگرم تھے۔ کوئٹہ میں بھی قومی اتحاد کے جلوس نکلتے، کبھی کبھار پختون اور بلوچ رہنما بھی جناح روڈ پر نعرہ بازی کرتے دکھائی دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ پانچ جولائی 1977ء کو سارے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ بھٹو صاحب اور دیگر سیاسی رہنماؤں کو حراست میں لے کر نظر بند کر دیا گیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ فضل الٰہی چودھری بدستور صدر پاکستان کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے دباؤ کے باوجود صدارت سے استعفیٰ نہ دیا۔

بلوچستان مارشل لاء زون ڈی تھا۔ پہلے میجر جنرل ایس ایم اے عباسی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ مجھے زون ڈی کے پی آر او کے فرائض انجام دینے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ میجر جنرل عباسی سخت گیر اور کم گو کمانڈر تھے۔ معمول کے مطابق

میں نے خوشامدانہ لہجے میں ایک اور فقرہ آگے بڑھایا، ''سر! آپ کی کمان میں آغاز سے ہی مخبری کا نظام بہت اعلیٰ دکھائی دیتا ہے''

Scanned with CamScanner

ایک مرتبہ کسی تیکھے قلم کار نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا'' کاش! لیاقت علی خان کے خلاف راولپنڈی سازش کیس میں ملوث تمام افراد کو فائرنگ سکواڈ کے حوالے کر دیا جاتا تو وطن عزیز سیاسی لحاظ سے صراط مستقیم پر گامزن رہتا''

پریس ریلیز کی منظوری خود کو کٹہرے میں کھڑا رکھنے کے مترادف تھی۔ انہیں متن سے زیادہ ٹائپنگ کے معیار اور فائل کے رنگ وغیرہ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ عسکری امور کی انجام دہی کے معاملے میں بے پناہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ان کا فوج میں بہت احترام تھا۔ بہاولپور کے شاہی خاندان سے تعلق کے باعث مخصوص مزاج رکھتے تھے۔ میجر جنرل عباسی جلد ہی مارشل لاء کی ڈیوٹی سے سبکدوش ہو گئے اور میجر جنرل عبداللہ سعید کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون ڈی مقرر کیا گیا۔ وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے کمانڈنٹ بھی رہ چکے تھے۔ یہ ہماری کیڈٹ شپ کا دور تھا۔ لہٰذا جب پہلی ملاقات میں انہیں معلوم ہوا کہ میں ان کے دور میں کیڈٹ رہا ہوں تو '' پلیز سٹ ڈاؤن'' کہہ کر پی ایم اے کی یادیں تازہ کرنے لگے۔ میری کتاب '' کاکولیات'' کا پہلا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا لیکن ابھی میجر جنرل عبداللہ سعید کے علم میں نہیں تھا۔ '' کاکولیات'' کی اعزازی کاپی پیش کی۔ بہت خوش ہوئے اور یوں زون ڈی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ ربط باہمی استوار ہو گیا جو کسی بھی پریس رابطہ افسر کے لئے لازم ہے کہ وہ سب سے سینئر شخصیت کا مزاج آشنا ہو اور ان کے اہداف کو بھرپور انداز میں سمجھ بھی سکے تا کہ متعلقہ ناظرین، سامعین اور قارئین تک بیانیہ پہنچ سکے۔

کاکولیات کا ذکر آیا تو ہفت روزہ ہلال کا ذکر ضروری ہے۔ یونٹ میں قیام کے دوران صرف ایک مضمون '' سلیوٹ'' ہلال میں شائع ہوا تھا۔ آئی ایس پی آر میں تعیناتی کے بعد ہفت روزہ ہلال کے آفس میں موقع ملتے ہی '' تحصیل شعور و آگہی'' کے لئے مصروف ہو جاتا تھا۔ اکرام قمر صاحب ایڈیٹر تھے اور محمد یونس صاحب ڈپٹی ایڈیٹر تھے۔ ادارتی عملے میں رشید اختر صاحب اور محمد افضل تحسین سرگرم تھے۔ میں نے '' روٹ مارچ'' کے عنوان سے پی ایم اے میں گزرے ایام کو یاد کیا اور تین اقساط میں ایک تربیتی مشق کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ اکرام قمر صاحب کی خدمت میں مسودہ پیش کیا۔ انہوں نے اصلاح کے بعد اسے شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ اکرام قمر صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ انہیں ادب، صحافت اور نثر نگاری پر مکمل عبور تھا۔ الفاظ کے پس منظر سے بھی آگاہ تھے۔ تلفظ کے معاملے میں بھی حساس تھے۔ ٹیلی فون پر اگر کوئی '' ہلال'' کے بجائے '' حلال'' کا دفتر کہتا تو معذرت غلط نمبر کہہ کر فون بند کر دیتے تھے۔ ان کی شخصیت کا چند سطور میں احاطہ ممکن نہیں۔ '' کاکولیات'' کو منطقی انجام تک پہنچانے میں اکرام قمر صاحب کا ہاتھ ہے۔ پی ایم اے کے بارے میں میرے مضامین قسط وار شائع ہو رہے تھے۔ اگر تاخیر ہو جاتی تو برساتی چھتری ہاتھ میں لیتے، مجھے آئی ایس پی آر کے دفتر میں تلاش کر کے جلی کٹی سناتے۔ ان کا اصرار تھا کہ پی ایم اے کیڈٹ کے بارے میں پہلی مرتبہ '' مشق سخن'' جاری ہے، اسے منقطع نہیں ہونا

چاہیے۔ جلد از جلد مکمل کر دو تاکہ کتاب شائع کی جائے۔ ''کاکولیات'' کے باعث فوج اور ادبی حلقوں سے بھی حوصلہ افزائی کے اشارے ملے۔ آرمی میں کمیشن کے خواہشمند نوجوانوں کی دلچسپی خوش آئند تھی۔ مداحوں کے خطوط اور ٹیلی فون وغیرہ سے بہت مسرت محسوس ہوتی تھی۔

بلوچستان میں میجر جنرل عبداللہ سعید کی زیر کمان امن و امان کی بحالی، ترقیاتی سرگرمیاں اور مارشل لاء ضوابط کے تحت ملٹری کورٹس کے فیصلوں کی تشہیر میں دن رات صرف ہو رہے تھے۔ کبھی کبھار منفی صورتحال پر قابو پانے کے لیے شب بیداری کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ ایک مرتبہ کوئٹہ کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر (بریگیڈیئر) کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے کوئٹہ کے ''مخصوص بازار'' پر پولیس وغیرہ کے ذریعے چھاپہ مارا اور وہاں مصروف تمام مرد عورتوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے روز مجھے حکم دیا گیا کہ ایک اہم کارروائی کی گئی ہے۔ اس کی بھرپور تشہیر ہونی چاہیے۔ جنرل ضیاء الحق کے حوالے سے اسلام پسندی کی رَو چل پڑی تھی۔ ہر چھوٹا بڑا سرکاری افسر اور اہلکار ایسا عمل بجا لانے کے لیے کوشاں رہتا تھا کہ جس کی انجام دہی کے بعد اس کی ''اسلام پسندی'' کا شہرہ ہو جائے۔ کوئٹہ کے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفتر پہنچا تو گراؤنڈ میں پچاس ساٹھ عورتیں منہ چھپائے بیٹھی تھیں، معلوم ہوا کہ ان کے ہمراہ گرفتار مرد جیل بھیج دیے گئے ہیں۔

البتہ بریگیڈیئر صاحب گرفتار خواتین کو موجودہ زندگی ترک کر کے نیک راہ اپنانے کی تلقین کریں گے۔ قبل اس کے کہ میں کچھ عرض کرتا۔ موصوف آفس سے باہر آگئے اور انہوں نے دینی احکامات بیان کرنے شروع کر دیئے۔ خواتین سر جھکائے خاموشی سے سن رہی تھیں۔ بریگیڈیئر صاحب نے تقریر کا اختتام اس بات پر کیا کہ آپ سب کو موجود سلسلہ ترک کر کے شادیاں کرنی چاہئیں۔ یہ بات کہنے کی دیر تھی کہ ایک بلند قامت خاتون جو قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھی۔ بریگیڈیئر صاحب کو اپنی جانب متوجہ کر کے کہنے لگی کہ ''آپ نے بہت اچھی باتیں کی ہیں۔ واقعی ہم سب کو شریفانہ زندگی گزارنی چاہیے۔ سب سے اچھی تجویز شادی کی ہے۔ کاش گھومنے پھرنے والے مردوں میں سے کوئی ہم سے شادی بھی کر لے تو سارا مسئلہ حل ہو جائے۔ شادی ایک نیک عمل ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس نیکی کا آغاز میرے ساتھ شادی سے کریں اور اپنے ماتحتوں کو حکم دیں کہ وہ بھی زمین پر بیٹھی ہوئی عورتوں میں سے کسی ایک سے شادی کر لے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ آپ کو دوبارہ ہمارے بازار میں پولیس بھیجنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی''۔

خاتون کی تقریر ختم ہوئی۔ چند لمحے سناٹا رہا۔ اب سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے جواب دینا تھا۔ وہ صرف یہ کہہ کر آفس میں چلے گئے کہ ''ان سب کو جیل بھجوا دیا جائے''۔ میں نے مارشل لاء ہیڈ کوارٹر

کراچی کے ہفت روزہ تکبیر میں سعود ساحر کی ڈائری شائع ہوئی جس میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ''آئی ایس پی آر کے نئے سربراہ صحافیوں سے پوچھتے ہیں کہ آپ کیا کام کرتے ہیں''

Scanned with CamScanner

اس زمانے کی ''ہائی کمان'' کو لمبے بال رکھنے اور وکٹورین انگریزی لکھنے اور بولنے والے ''کرنل'' سے براہ راست ہدایات لینا پسند نہیں تھا، شاید کرنل سلہری بھی ذہنی لحاظ سے ''یس سر'' کے پابند نہیں تھے

زون ڈی میں اعلیٰ افسران کو ساری روداد سنائی۔ بات میجر جنرل عبداللہ سعید تک بھی پہنچی۔ ان کا حکم تھا کہ یہ روداد کسی اخبار میں نہیں آنی چاہیے۔ انہوں نے آئندہ کے لیے فلاحی، اصلاحی اور تبلیغی اقدامات کے لیے رہنما کمیٹی بنادی تاکہ انفرادی نوعیت کی کارروائیوں کی روک تھام کی جاسکے۔

بلوچستان میں آئی ایس پی آر افسر کی حیثیت سے چار برس سے زائد عرصہ قیام کیا۔ زیادہ وقت کوئٹہ میں ہی گزرتا رہا تھا۔ اندرون بلوچستان کے شہر، قصبے اور دیہات بھی قریب سے دیکھے۔ خاص طور سے لوگوں کے مسائل اور درپیش مشکلات سے آگہی ہوتی۔ کچھ ہی عرصے میں وسیع حلقہ احباب جن میں زیادہ تر صحافی، ادیب اور اساتذہ شامل تھے ذہنی اور سماجی پذیرائی کے لیے ترتیب پا چکا تھا۔ جناح روڈ پر بک لینڈ کتابوں کی مشہور دکان میں سلیم بخاری صاحب کی صورت میں برادرانہ ماحول میسر تھا۔ ساتھ زیدی فوٹوگرافر خوش آمدید کہنے کے لیے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ زیدی صاحب مدت تک کوئٹہ میں آئی ایس پی آر کے لیے بھی پیشہ وارانہ خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد میں میرے اصرار پر مستقل سرکاری فوٹوگرافر تعینات کر دیے گئے۔ کوئٹہ سے واپس راولپنڈی پوسٹنگ کے احکامات موصول ہوئے تو چند روز طبیعت ملول رہی۔ اس شہر سے ہماری بے پناہ خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ ذاتی اور سرکاری لحاظ سے گرم سرد حالات سے گزرنا ہوا۔ کبھی کبھار پانی میں ڈبکی بھی لگی، یہ سب زندگی کے حصے ہیں۔ اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ کوئٹہ میں بسر کیے شب و روز آج بھی تنہائی میں گدگداتے ہیں۔ اس شہر میں ہی ہماری بیچلر لائف کا خاتمہ ہوا۔ شادی شدہ افسر کی حیثیت سے سرکاری فرائض کی انجام دہی ایک علیحدہ ''واردات'' ہے۔ زندگی میں اچانک ایک ایسی شخصیت سے احکامات موصول ہونا شروع ہوجاتے ہیں جہاں حکم عدولی کی گنجائش نہیں۔ سرکار احکامات پر عمل درآمد کے عوض تنخواہ دیتی ہے جبکہ گھر کی حکومت کو تنخواہ دے کر احکامات وصول کرتے ہیں۔ میرے بعد آئی ایس پی آر کوئٹہ میں میجر بشیر کیانی تعینات کیے گئے۔ انہیں ریڈیو جرنلزم کا وسیع تجربہ تھا۔ ایم اے صحافت پنجاب یونیورسٹی ہی سے کیا تھا۔ ہم سے پہلے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔

آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ پہنچتے ہی معمول کے فرائض کی ادائیگی شروع ہوگئی۔ بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی سربراہ تھے۔ یہ آئی ایس پی آر میں کیپٹن کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے۔ اس سے قبل ''پاکستان ٹائمز'' میں خدمات انجام دیں۔ یوں آئی ایس پی آر کو کچھ ''وقفے'' کے بعد ایک ایسا سربراہ میسر آگیا تھا جو تعلقات عامہ، انگریزی اردو جرنلزم اور ابلاغ کے شعبے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ صحافت کی دنیا کے بڑے چھوٹے ''تفضّل بھائی'' کہتے نہیں تھکتے تھے۔ بریگیڈیئر صدیقی جونیئرز کے

لیے معلم کا درجہ رکھتے تھے، ہم سے ہمیشہ ایک مشفق استاد کی مانند برتاؤ کیا۔ انہیں آئی ایس پی آر کی عمارت، دفاتر، گاڑیوں وغیرہ سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے ان کے دور میں کبھی وسیع پیمانے پر دفاتر کی مرمت وغیرہ ہوتے نہیں دیکھی تھی۔ انہیں ورثے میں جو سٹاف کار ملی اسی پر ہی اپنی سروس مکمل کی۔ دفتر کے قریب ہی ایک آفیسرز میس میں قیام پذیر تھے۔ رینک کے لحاظ سے پروٹوکول کے عادی نہیں تھے۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو شاید فوٹو گرافر یا کیمرہ مین کی موٹر سائیکل پر بیٹھنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ یہ ہم ایسے جونیئر کیپٹن انہیں دن میں ایک دو مرتبہ بریگیڈیئر ہونے کا احساس دلاتے تھے۔ واقعات کی ایک طویل فہرست ہے۔ تاہم چند ایک کا ذکر ہی مناسب ہوگا۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ابلاغی محاذ کافی حد تک آئی ایس پی آر کے حوالے کر دیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد میجر جنرل مجیب الرحمٰن سیکرٹری اطلاعات مقرر ہوئے تو ہم پر کارکردگی کا دباؤ کم ہو گیا۔ کرنل صدیق سالک (بعد میں بریگیڈیئر) ان کے پریس سیکرٹری تھے، یوں آئی ایس پی آر کی ایک اور بلند قامت شخصیت کی خدمات بھی جنرل محمد ضیاء الحق کو حاصل تھیں۔ ہمارے دفتر سے روزانہ پریس سمری جایا کرتی تھی۔ اس میں اخبارات، الیکٹرانک میڈیا، جرائد وغیرہ سے اہم مضامین، خبریں اور دیگر معلومات درج ہوتی تھیں۔ جنرل محمد ضیاء الحق ذاتی طور پر بھی اہم اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے۔ اداریے اور کالم بھی پڑھتے تھے۔ یہ صورتحال سمری تیار کرنے والے عملے کے لیے ''پریشان کن'' تھی کہ کہیں اہم کالم، اداریہ یا خبر سمری سے رہ نہ جائے۔ جنرل محمد ضیاء الحق کبھی کبھار اس جانب اشارہ کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جنرل محمد ضیاء الحق کے صف اول کے تمام مدیروں، صحافیوں اور ادیبوں سے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ اس ربط باہمی میں بھی بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کا اہم کردار تھا۔ مارشل لاء حکومت کے باوجود ''فرینڈلی پریس'' کی موجودگی سے ہمارا کام نسبتاً آسان تھا۔ راولپنڈی میں قیام کے دوران 23 مارچ کو منعقد ہونے والی پاک افواج کی مشترکہ پریڈ اہم ترین ایونٹ تھا۔ راولپنڈی ریس کورس گراؤنڈ میں یہ شاندار تقریب منعقد ہوتی تھی۔ آئی ایس پی آر کی براہ راست ذمہ داری پریڈ گراؤنڈ، پی ٹی وی اور ریڈیو پاکستان کے ذریعے رواں تبصرے (کمنٹری) کا انتظام تھا۔ بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کی نگرانی میں یہ ڈیوٹی ''دو آتشہ'' تھی۔ ایک ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کو کمنٹری کے مندرجات سے مطمئن رکھنا، انہیں ''آل اوکے'' سن کر یہ اطمینان ہوتا تھا۔ گراؤنڈ میں پریڈ کمانڈر کے اپنے احکامات تھے۔ ان پر عمل درآمد کے سوا چارہ نہیں تھا۔ کیپٹن کی حیثیت سے دو مرتبہ کمنٹری کی ذمہ داری میں ہاتھ بٹانے کا موقع ملا۔ پی ٹی وی کے اظہر لودھی صاحب

میں نے دوبارہ کہا: ''سر! یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ ہم ہر صحافی ادیب اور میڈیا سے منسلک شخص اور ادارے کی تعریف کرتے رہیں خواہ ''دل'' راضی نہ بھی ہو''

Scanned with CamScanner

این پی ٹی نے منافع بخش اخبارات کو تحویل میں لے کر نظری لحاظ سے ''بددیانتی'' پر مبنی اقدامات کیے جس کے باعث روز اول ہی سے ایک اہم قومی ادارہ مشکوک ہو گیا اور آخر کار اپنے ساتھ مقبول ترین اخبارات کو بھی لے ڈوبا

اور خالد حمید صاحب کہنہ مشق اور ہر دم تیار ایسی خصوصیات کے حامل تھے۔ صبح شام ریہرسل جاری تھی۔ فوجی دستوں کی پریڈ کے ساتھ کمنٹری باکس سے بھی آنکھوں دیکھا حال سنایا جاتا تھا۔ ہمارا اصل امتحان فائنل ریہرسل تھی جس کے اختتام پر کمنٹری کے بارے میں منفی تبصرے سن کر ہشاش بشاش دفتر واپس آنا بھی فرائض میں شامل تھا۔ دراصل بریگیڈیئر صدیقی ناموافق حالات میں بھی مطمئن رہتے تھے۔ 23 مارچ پریڈ کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق کمنٹری ٹیم کو آرمی ہاؤس مدعو کرتے تھے اور یہ ملاقات پریڈ کے فوراً بعد طے تھی۔ ایک مرتبہ اظہر حمید لودھی، خالد حمید اور بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کے ہمراہ آرمی ہاؤس کے برآمدے میں انتظار کر رہا تھا کہ جنرل محمد ضیاء الحق برآمدہ ہی میں آ گئے۔ بید کی کرسیاں تھیں اور سامنے میز پر سیون اپ کی بوتلیں رکھ دی گئیں۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے ابھی پریڈ کی یونیفارم تبدیل نہیں کی تھی۔ شاندار پریڈ کے بعد بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اظہر لودھی اور خالد حمید کی بھی خوب تعریف کی۔

بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کو بھی شاباش دی اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے: ''یہ بتایئے کہ سب سے اچھی پریڈ کس دستے نے کی تھی؟'' میری رائے سے قبل ہی پنجاب رجمنٹ، فضائیہ اور آرمرڈ کور، بحریہ وغیرہ کے نام بلند ہونے لگے۔ اس حوالے سے بحث میں سیون اپ کا وقفہ آیا تو میں نے ''بوائے سکاؤٹس'' کے دستے کی تعریف کی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کہنے لگے ''وہ کیسے؟'' میرا جواب تھا کہ سر! بوائے اسکاؤٹس کسی آرمی فارمیشن سے نہیں ہیں۔ سکولز کے طالب علم ہیں۔ آپ نے ان کا سلامی دیتے ہوئے جوش و خروش دیکھا ہوگا۔ میرے خیال میں ان کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ کل انہیں پریڈ میں شامل دیگر دستوں کے ساتھ کھانے پر مدعو نہیں کیا گیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے فوراً اپنے اے ڈی سی کو طلب کیا اور اس حوالے سے احکامات دیئے۔ ''بڑا کھانا'' کے موقع پر جنرل محمد ضیاء الحق جب بوائے سکاؤٹس دستے کے ڈائننگ ایریا میں آئے تو انہوں نے بلند آواز سے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ بچو! آج آپ ان انکل کی وجہ سے آئے ہیں۔ انہوں نے کل آپ کی پریڈ کی بہت تعریف کی۔ شاباش، ویلڈن۔

ایک اور واقعہ بیرون ملک دورے سے متعلق ہے۔ ایک روز بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کی جانب سے ارجنٹ بلاوا موصول ہوا۔ گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا، لہٰذا سائیکل ہی پر دفتر بھاگا۔ ہانپتے کانپتے آفس میں داخل ہوا۔ ڈائریکٹر آفس کی لائٹس ''آن'' تھیں۔ حاضری دی تو بریگیڈیر صدیقی نے ایک فائل میری جانب سرکا دی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کے ہمراہ پریس پارٹی کی فہرست تھی اور آخر میں سبز قلم سے کیپٹن صولت رضا لکھا ہوا تھا۔ یہ اضافہ

Scanned with CamScanner

جنرل صاحب نے خود کیا تھا اور حکم نامہ بریگیڈیئر صدیقی کے نام تھا۔ کہنے لگے پاسپورٹ ہے؟ میرا جواب تھا، نہیں۔ کہنے لگے شناختی کارڈ ہے؟ ''جی نہیں''۔ شیروانی ہے؟ ''جی نہیں''۔ طبیعت کے برعکس بریگیڈیر صدیقی صاحب میری جانب سے مسلسل نہیں نہیں سن کر برہم ہوگئے اور انتہائی شستہ لہجے میں ڈانٹ ڈپٹ کرنا شروع کردی۔ دوروز بعد روانگی ہے۔ تم نہ گئے تو جنرل محمد ضیاء الحق کو کون جواب دے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔

قصہ مختصر رات گئے پاسپورٹ، شناختی کارڈ کے فوری حصول کے لئے رشید اختر صاحب (نائب مدیر ہلال) کو ذمہ داری دی گئی۔ اسی طرح دو شیروانیاں بھی ٹرائل کے لیے منگوائی گئیں۔ ایک تنگ اور دوسری ڈھیلی ڈھالی۔ ''بس آپ جہاز پر بیٹھ جانا۔ میں کوئی اور عذر نہیں سننا چاہتا''۔ صدیقی صاحب نے فیصلہ کن انداز میں حکم صادر فرمایا۔

جنرل محمد ضیاء الحق ترکی، قطر، اردن، بحرین اور عمان (Oman) کے دورے پر جارہے تھے۔ جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق، بیگم ضیاء الحق اور ذاتی سٹاف کے اراکین داخل ہوئے۔ بریگیڈیر (تب کرنل) صدیق سالک بھی ہمراہ تھے۔ جہاز پرواز کر گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق وی آئی پی کیبن سے باہر آئے اور انہوں نے سفر میں شامل رفقاء سے فرداً فرداً ہاتھ ملانا شروع کر دیئے۔ پریس پارٹی کی جانب آئے تو گرمجوشی نمایاں تھی۔ میں سب سے آخر میں ایک سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق سب سے ملتے ہوئے ہماری جانب آئے اور مجھے دیکھتے ہی کہا: ''صولت صاحب بھی ہمارے ساتھ جارہے ہیں۔ سالک! اس پر نظر رکھنا۔ واپس بھی لے کر جانا ہے''۔ ان کی اس بات پر قہقہہ گونجا اور مجھے کرنل صدیق سالک نے اشارہ سے طلب کرلیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق جونہی کیبن میں واپس گئے، سالک صاحب نے جواب طلبی شروع کر دی۔ ''تم کیسے آئے ہو، تمہارا نام تو لسٹ میں نہیں تھا''۔ سر! مجھے کچھ معلوم نہیں، بریگیڈیر صدیقی نے پرسوں رات احکامات پاسپورٹ اور شیروانی حوالے کی تھی۔ حکم تھا کہ جہاز میں سوار ہو جاؤ! سالک صاحب بولے ''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' میں نے جواب دیا: ''سر! میں سمجھا کہ آپ کے کہنے پر میرا نام شامل کیا گیا ہے''۔ میرے اس جواب کے بعد طویل خاموشی طاری ہوگئی۔ چند لمحے توقف کے بعد کہنے لگے آپ کہیں گم نہ ہو جانا، تمہیں ساتھ واپس لے کر جانا ہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا حکم ہے''۔ آخری جملے کا لہجہ نوکدار تھا۔ دس روزہ دورے میں ترکی میں زیادہ قیام تھا۔ استنبول کی شہرہ آفاق مسجد میں تبرکات کی زیارت کرائی گئی۔ خاص طور پر جبہ مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے دیکھ کر عجب کیفیت طاری تھی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ دل سے دعائیں جاری تھیں۔ میرے

ایک ایئر ہوسٹس نے ایمرجنسی گیٹ کے پاس
قاضی اسد عابد (''عبرت'') اور سجاد میر (''حریت'') کو بٹھایا اور
یہ ہدایت کی کہ جہاز رکتے ہی ایمرجنسی گیٹ کھول دیں

Scanned with CamScanner

بریگیڈیئر ریاض اللہ کا خیال تھا کہ آصف نواز کے آرمی چیف تعینات ہونے کے امکانات زیادہ ہیں کیونکہ حمید گل مخصوص پس منظر رکھتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ سیاسی قیادت ایک خالص پیشہ وارانہ پس منظر رکھنے والے جنرل آفیسر کو ترجیح دے

دل میں اچانک لاہور کا خیال آ گیا۔ ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے لاہور جانا ہے''۔ بس یہ جملہ ادا ہوا تھا کہ سب نے دوسری جانب حرکت شروع کر دی۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے چند منٹ توقف کیا اور کہنے لگے کہ مغرب کی نماز پڑھ کر ہی آگے جائیں گے۔ شاید سرکاری پروگرام میں نماز شیڈول نہیں تھی۔ لہذا میزبان چند لمحے پریشان دکھائی دیئے۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے پی ٹی وی کے سینئر کیمرہ مین اسلم خان سے کہا ''خان صاحب، اذان دیجیے۔ نماز بھی آپ ہی پڑھائیں گے''۔ اسلم خان صاحب نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی، ابھی اذان مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک کلین شیو ترک امام تشریف لائے۔ نماز مغرب سب نے ادا کی۔ نوافل کے بعد مسجد سے باہر آئے تو سینکڑوں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ اللہ اکبر۔ پاکستان..... پاکستان..... کے نعرے بلند ہونے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر جنرل محمد ضیاء الحق ایک گاڑی کی چھت پر چڑھ گئے اور والہانہ انداز میں تقریر شروع کر دی۔ انگریزی میں ترک عوام کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ ترکی میں پاکستان کے ساتھ دلی وابستگی کے مناظر جابجا نظر آئے۔ پاکستانی صدر کی تقریر ختم ہوئی تو تالیوں اور نعروں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جس کی گونج آج بھی ان لمحات کی یاد کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ قطر، بحرین اور اومان میں میزبانی کا منفرد انداز تھا۔ سرکاری اور ذاتی تحائف کے انبار تھے لیکن عوام ندارد۔

ہمارے وفد میں روزنامہ مہران سکھر کے ایڈیٹر سید سردار علی شاہ بھی شامل تھے۔ علالت کے باوجود خوش گفتار اور ہنس مکھ رہنے پر مصر تھے۔ قطر میں وفد اراکین کے لیے سیکورٹی کارڈ تقسیم کیے جا رہے تھے۔ میں شاہ صاحب کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ متعلقہ میزبان افسر نے ایک نام پکارا ''سید نذیر مسیح''۔ شاہ صاحب چونکے، یہ کون ہے؟ میں نے بتایا کہ صدر مملکت کے ذاتی سٹاف میں ہیں ''لیکن یہ سید کیسے ہو گیا؟'' میں نے بتایا کہ شاہ صاحب، پاکستان کی لغت میں ''سید'' نہیں ہیں۔ یہ عربی کا کمال ہے، انہوں نے جناب کا ترجمہ کیا ہے۔ اب نذیر مسیح صاحب کو ''سید'' کے ساتھ کارڈ مل گیا جسے دکھا کر وہ پاکستان میں ریٹائرمنٹ کے بعد تعویز گنڈے کا بزنس آسانی سے جاری کر سکتے ہیں''۔ شاہ صاحب میری بات سن کر ملول ہوگئے اور میزبان افسر کے بارے میں ''ادارتی'' لہجے میں گفتگو شروع کر دی۔ اتنے میں گرم قہوہ آ گیا۔ ہم نے دو تین چسکیاں لے کر موضوع بدل دیا۔

اردن میں پروٹوکول شاہی تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پاکستان اور اردن جڑواں بھائی ہیں۔ میزبان اور مہمان یک جان دو قالب دکھائی دیے۔ اردن سے اومان جانا تھا۔ کسی نے یہ خبر اڑا دی کہ پہلے عمرہ کرنے سعودی عرب جائیں گے۔ شام سے پہلے واضح تردید ہوگئی۔ اومان میں ہمارا قیام مختصر رہا۔

Scanned with CamScanner

بلوچستان سے ملتے جلتے جغرافیائی خدوخال دکھائی دے رہے تھے۔ پاکستان کے حوالے سے ہر ملک میں خوش آمدید، بھرپور پذیرائی اور عزت و وقار کا سماں تھا۔ واپسی پی۔آئی۔اے کے خصوصی طیارے کے ذریعے تھی۔ حسب سابق جنرل محمد ضیاء الحق، بیگم صاحبہ اور سینئر سٹاف ممبرز اگلی نشستوں پر تشریف فرما تھے۔ جہاز کی پرواز وطن عزیز کی جانب جونہی ہموار ہوئی تو صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے وفد میں شامل سرکاری اور میڈیا کے نمائندوں سے ''الوداعی'' مصافحہ شروع کر دیا۔ ایڈیٹر، رپورٹر، کیمرہ مین، لائٹ مین سمیت کوئی شخص چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے تعلقات عامہ کی خصوصی شعاعوں سے محفوظ نہیں تھا۔ آئی ایس پی آر کی ٹیم سب سے آخر میں موجود تھی۔ میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں نشست سے کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگے ''تشریف رکھیے۔ سنایئے، کیسے رہا یہ سفر؟''۔ میں نے حسب معمول دو چار فقروں میں تعریف کر دی۔ میری بات ختم ہوئی تو کہنے لگے کہ ''ہلال'' میں تاثرات ضرور لکھئے گا''۔ میں نے رائٹ سر کہا اور جانے کیوں میں نے کہہ دیا کہ ''سر! میرے لائق کوئی خدمت؟'' دراصل پبلک ریلیشنز کی ڈیوٹی ادا کرتے ہوئے بعض جملے اور الفاظ روزمرہ بول چال کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جانے انجانے میں پی آر او موقع محل دیکھے بغیر گنگناتا رہتا ہے۔ میری بات سن کر جنرل محمد ضیاء الحق ایک لمحے کے لیے رکے اور اپنا مخصوص قہقہہ بلند کیا۔ کیپٹن کے کاندھے کو تھپتھپایا اور ''تھینک یو۔ تھینک یو'' کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ آئی ایس پی آر میں میرے سینئر اور ''رہنما'' کرنل صدیق سالک (بعد میں بریگیڈیئر) بھی یہ مکالمہ سن رہے تھے۔ انہوں نے صدر صاحب کے جاتے ہی مجھے اپنی نشست کے قریب طلب فرمایا اور کہا کہ ''مسٹر! یہ کیا کہہ رہے تھے آپ؟ ایک کیپٹن آرمی چیف اور صدر مملکت کو کہہ رہا ہے کہ سر! میرے لائق کوئی خدمت؟۔ تم جانتے ہو کس سے بات کر رہے تھے، صدر پاکستان، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور آرمی چیف سے۔ ہوش میں تو ہو؟ بریگیڈیئر صدیق سالک بنیادی طور پر ایک ادبی شخصیت تھے۔ ان کا بات چیت اور مکالمے کا انداز منفرد تھا۔ موقع محل دیکھ کر ہم بھی ''درباری انداز'' میں لطف اٹھایا کرتے تھے۔ تاہم اس روز وہ مجھے سنجیدہ دکھائی دیئے۔ ان کی سرزنش یقیناً سبق آموز تھی۔ عسکری زندگی کے سفر میں کئی بار ایسا ہوا کہ ہم نے کسی بڑے سینئر کو جنرل محمد ضیاء الحق سمجھ کر لطیف پیرائے میں گفتگو کی کوشش کی تو منہ کی کھائی۔ جس کے بعد منہ کا زاویہ اور ذائقہ تبدیل کرنے میں کافی وقت صرف ہوا۔ تب بریگیڈیئر صدیق سالک کی نصیحت یاد آتی تھی۔ ہمیشہ کندھے اور کالر پر رینک دیکھ کر ہی ''مشق سخن'' کی جرات کرتا تھا۔

راولپنڈی واپس پہنچتے ہی ہم تاثرات لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ''اخوت کا سفر'' کے عنوان تلے

جنرل آصف نواز نے مزید ہدایت کی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول یاد رکھیں: ''خبردار ایک لمحے کے لیے بھی کسی انسان کی خوشنودی کے لئے اللہ تعالیٰ کی ناراضی مول نہ لو''

Scanned with CamScanner

جنرل آصف نواز علی الصبح بیدار ہونے کے عادی تھے اور آٹھ بجے صبح اپنے آفس میں موجود ہوتے تھے

متعدد اقساط میں سفرنامہ ہفت روزہ ہلال میں شائع ہوا۔ دوست احباب، کورس میٹ، کولیگ حاشیہ آرائی میں مصروف ہوگئے۔ اکثر ہماری صدارتی سفر پیمائی سے لاعلم تھے۔ اس دوران بریگیڈیئر صدیق سالک نے اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا کہ لکھا تو تم نے خوب ہے لیکن یہ ''اخوت کا سفر'' صحیح کتابت نہیں ہوا۔ میں نے گھبرا کر ہر زاویے سے کتابت دیکھی، اخوت کا سفر ہی لکھا تھا۔ میں سفرنامے میں استنبول میں قیام کا حال لکھ رہا تھا تو آنکھوں کے سامنے جبہ مبارک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لمحات آ گئے۔ دعا دل سے کئی بار دہرائی گئی۔ ہفتے دس روز بعد شمارہ شائع ہوگیا ابھی شاید تقسیم کے مراحل سے گزر رہا تھا کہ متعلقہ دفتر سے اطلاع ملی کہ مجھے لاہور تعینات کرنے کا فیصلہ ہوگیا ہے۔ چند روز میں باقاعدہ احکامات جاری ہو جائیں گے۔ یوں میجر کا رینک بھی مل جائے گا۔ لاہور میں آئی ایس پی آر کے تجربہ کار اور میرے سینئر افسر میجر محمد غازی الدین تعینات تھے۔ انہیں پی آر او مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پنجاب کی اضافی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی تھی۔ لاہور پہنچا تو میجر غازی نے ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کا شہر ہے۔ میڈیا میں پہلے سے آپ کی علیک سلیک ہے۔ آپ پنجاب یونیورسٹی شعبہ صحافت سے فارغ التحصیل ہیں۔ کلاس فیلوز اور ڈیپارٹمنٹ فیلوز کے دائرے موجود ہیں لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل سردار ایف ایس لودھی اپنے نام کے انگریزی ہجوں کے بارے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ بہت مشکل سے اپنی گردن بچائی ہے۔ میجر محمد غازی الدین ہمارے ڈائریکٹر بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کے پسندیدہ افسر تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل کے رینک سے ریٹائر ہوئے۔ بہت محنتی، فرض شناس اور ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔ بدقسمتی سے راولپنڈی میں بریگیڈیئر صدیقی کے ساتھ بعض غلط فہمیوں کے باعث نیوی کے پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ میں تعینات کر دیئے گئے۔ کراچی یونیورسٹی کے جرنل ازم ڈیپارٹمنٹ سے فارغ التحصیل تھے۔ یوں ان کا بھی وسیع حلقہ احباب تھا۔ ان میں ایک اہم خوبی معمول کی تقریبات کے پریس ریلیز کی قبل از وقت تیاری تھا۔ وہ غیر سرکاری پریس نمائندوں کو پیشہ وارانہ لحاظ سے ہمیشہ ''زیر دام'' ہی رکھتے تھے۔ یہ نمائندے تقریب کے چائے کھانے یا خوش گپیوں میں مصروف ہوتے تو میجر غازی الدین پہلے سے تیار شدہ پریس ریلیز کی نوک پلک زمانہ حال کے مطابق درست کر کے اسے اخبار یا نیوز ایجنسی کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ ہم نے ان سے بہت سیکھا لیکن دفتر کے ڈرائیورز یا نائب قاصد وغیرہ کے سامنے سینئر موسٹ افسر کی ''زبانی گوشمالی'' سے ہمیشہ پرہیز کیا کیونکہ یہ عادت میجر غازی کے لیے باعث آزار ثابت ہوتی۔

بات جنرل لودھی کی ہو رہی تھی۔ لیفٹیننٹ

جنرل سردار ایف ایس لودھی انگریزی میں Lodhi کے بجائے Lodi لکھا کرتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ اخبارات میں بھی ان کے پسندیدہ ہجے کے ساتھ نام شائع ہونا چاہیے۔ میرے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ خاص طور سے ''پاکستان ٹائمز'' میں ڈیسک پر موجود قدآور صحافیوں کو Lodi لکھنے پر آمادہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ دو تین مرتبہ اگر پسندیدہ ہجے شائع نہ ہوئے تو لاہور سے چھٹی ہو جائے گی۔ اللہ خوش رکھے پاکستان ٹائمز کے نیوز ایڈیٹرز اور سب ایڈیٹرز کو۔ انہوں نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ ان میں سے چند ایک مارشل لاء سے ذہنی لحاظ سے ''برسرپیکار'' بھی تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل سردار ایف ایس لودھی کچھ عرصہ بعد گورنر بلوچستان تعینات ہو گئے۔ یوں تعلقات عامہ کا ایک بڑا امتحان جس میں تمام تر کوشش اور کاوش کے باوجود فیل ہونے کے خدشات لاحق تھے ہمارے کورس سے ''منہا'' ہو گیا۔

لیفٹیننٹ جنرل لودھی زیادہ عرصہ گورنر نہیں رہے۔ انہوں نے حلف اٹھانے کے بعد مجھے کوئٹہ سے لاہور فون کیا اور ہدایت کی کہ کوئٹہ میں جو بھی سیٹ اپ ہے انہیں بتا دو کہ میرے نام کے ہجے درست شائع ہونے چاہئیں۔ کوئٹہ میں چار برس سے زائد ڈیوٹی ادا کی تھی۔ بلوچستان کے ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز ممتاز شاعر، ادیب عطا شاد تھے۔ میں نے انہیں فون کیا، حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ ابھی گورنر ہاؤس سے آرہا ہوں۔ کسی نے نام کے ہجے کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ ''سر! عسکری راز ہے۔ اپنوں ہی سے کہلوانا تھا''۔ آپ کی مہربانی ہوگی ورنہ مجھے لاہور سے کوئٹہ طلب کر لیں گے۔ جنرل لودھی کو منصب سنبھالے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ایک روز ضروری میٹنگ کے لئے اسلام آباد آرہے تھے کہ خراب موسم کے باعث طیارہ گر کر تباہ ہو گیا۔ جہاز کا عملہ اور گورنر بلوچستان کے اے ڈی سی جاں بحق ہو گئے، لیفٹیننٹ جنرل لودھی زندہ بچ گئے لیکن شدید زخمی تھے۔ علاقے میں موجود ایک چرواہا بچے نے جہاز کو گرتے ہوئے دیکھ لیا، وہ گاؤں سے بھاگا اور چند بڑوں کو بلا لایا۔ انہوں نے شدید زخمی گورنر کو ٹرالی میں ڈالا اور قریبی شفاخانے کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہیں تیل اور ہلدی کا محلول پلاتے اور زخموں پر لگاتے رہے۔ قصہ مختصر موسم ٹھیک ہوتے ہی ہیلی کاپٹر پہنچا اور جنرل لودھی کو ملٹری ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ مدت کے بعد مکمل صحت یاب ہوئے۔ کراچی میں قیام پذیر ہو گئے اور مختلف تعلیمی اداروں میں انٹرنیشنل ریلیشنز پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ دو برس ہوئے ان کا انتقال ہوا۔ حق مغفرت کرے!

لاہور میں قیام کے دوران لیفٹیننٹ جنرل اسلم شاہ کے زمانے میں بھارت کی جانب سے حملے کا خطرہ بڑھ گیا۔ افواج چھاؤنی سے سرحدی علاقوں کی جانب کوچ کر گئیں۔ بھارتی آرمی چیف جنرل سندر جی نے حملے کے لیے تہیہ کیا ہوا تھا۔ راجیو گاندھی

کئی مرتبہ آصف نواز بریفنگ میں یہ بات دہراتے تھے کہ فوج کو ملکی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں ہم اس کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے

Scanned with CamScanner

مشہور تھا کہ نواز شریف نے قومی اسمبلی کے بعض اراکین کو یقین دلایا تھا کہ ان کے بیٹے، بھتیجے اور بھانجے وغیرہ جو فوج میں خدمات انجام دے رہے ہیں انہیں سول سروس میں ٹرانسفر کر دیا جائے گا لیکن جنرل آصف نواز نے دوٹوک الفاظ میں ''اعتراض'' اٹھا دیا

بھارت کے وزیر اعظم تھے۔ لاہور میں مشہور تھا کہ 1965ء کی مانند بھارت لاہور پر قبضے کی پوری کوشش کرے گا لیکن اس مرتبہ اصل ہدف سندھ ہے۔ بھارت کے خیال میں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کے باعث سندھ کے بعض علاقوں میں ریاست مخالف جذبات موجود ہیں جن سے مشرقی پاکستان کی مانند فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بہر حال طویل داستان ہے۔ پاکستان کے حکمران جنرل محمد ضیاء الحق تھے جنہوں نے دہلی میں راجیو گاندھی کو حملے کی صورت میں تا قیامت بربادی کا مژدہ سنا دیا تھا۔ یوں حملے کی کیفیت میں کمی آ گئی۔ لاہور میں مورچہ زن پاک فوجیوں کے جذبات ہمیشہ کی طرح سربلند تھے۔ انہیں علم تھا کہ اس علاقے کی ایک ایک اینچ کی حفاظت جزو ایمان ہے۔

بھارتی حملے کا خطرہ ٹل گیا۔ دونوں ممالک کی افواج زمانہ امن کی پوزیشن پر واپس آ گئیں تو لاہور چھاؤنی میں بھی معمول کی سرگرمیاں، تقریبات اور چہل پہل کا آغاز ہو گیا۔ فورٹریس سٹیڈیم میں ہر سال منعقد ہونے والے ہارس اینڈ کیٹل شو کی پبلسٹی، گراؤنڈ کمنٹری اور مجموعی میچ کی شب و روز حفاظت آئی ایس پی آر کی ذمہ داری تھی۔ کہنے کو یہ میلہ مویشیاں تھا لیکن اس میں انسانوں کی شرکت تعداد کے لحاظ سے مویشیوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ جانوروں کی مانند ہر ٹائپ کا انسان اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے موجود ہوتا تھا۔ ظاہر ہے اخبارات کب تک روزانہ ایک ہی انداز کی خبر فرنٹ پیج کی زینت بنائیں گے۔

راولپنڈی کی یوم پاکستان پریڈ 23 مارچ کے بعد ذہن سے اتر جایا کرتی تھی لیکن لاہور کا میلہ مویشیاں دس روز تک شب و روز پیشہ وارانہ صلاحیتوں اور تعلقاتِ عامہ کا ایک امتحان تھا۔ گراؤنڈ کمنٹری کی نگرانی کے لئے لازم تھا کہ کمنٹری کرنے والے حضرات ہماری مرضی کے ہوں۔ اس میدان میں ریڈیو پاکستان کے عزیز الرحمٰن کمال کی شخصیت تھے، بھاری بھرکم آواز، میلہ مویشیاں کے تمام صوتی اور بصری تقاضے پورے کرتے ہوئے جب فورٹریس سٹیڈیم میں گونجتی تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔ میلے کے تماشے کئی گھنٹوں پر محیط تھے۔ عزیز الرحمٰن کی انرجی بحال رکھنے کے لئے ہم چائے، کافی اور سینڈوچ وغیرہ سکرپٹ کے ساتھ ساتھ حاضر رکھتے تھے۔ ایک حد تک یہ سلسلہ چلتا تھا لیکن سٹینڈ بائی کمنٹریز کو بھی لانچ کرنے کی نوبت آ جاتی تھی۔ یہ مرحلہ خاصا اعصاب شکن تھا۔ ہم چند لمحوں کے لئے چوک گئے تو ڈائس کے سامنے سے گزرنے والے گھوڑے، خچر کی بجائے دوآبہ کی بھینس کی خصوصیات پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا۔ انتظامیہ کی ایک اہم ترین شخصیت نے دباؤ ڈال کر ایک مشہور ٹی وی اداکار کو کمنٹری باکس میں بھیج دیا۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ آئی ایس پی

Scanned with CamScanner

آرکا سکرپٹ نہیں پڑھیں گے اور رواں تبصرہ کریں گے۔ کھلی آنکھ کے ساتھ ہم نے بہت منت سماجت کی کہ جناب آپ فلم ڈرامے میں بھی سکرپٹ کے مطابق ہی ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ یہ بھی زندہ ڈراما ہی سمجھ لیں۔ سٹیڈیم میں اہم ترین ملٹری اور سول شخصیات اور شہر لاہور کے اکابرین، رؤسا اور اخبارات کے نمائندے موجود ہیں۔ بہرحال انہوں نے جب واک آؤٹ کی دھمکی دی تو ہم بھی خاموش ہوگئے، میلہ مویشیاں کا ایک اہم ایونٹ ڈاگ ریس تھی۔ اس میں تربیت یافتہ کتے، اپنے مالک کے اشاروں پر تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ریس کا دورانیہ مختصر، لہٰذا رواں تبصرہ کرنے والے کو پلک جھپکنے کی ہی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ اداکار کمنٹریز کو ہر طرح سے بریف کیا گیا۔ سٹیڈیم کے بائیں جانب سے کتے نکلے، اب کمنٹریٹر کو بھی ان کے ساتھ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے رہنا چاہیے تھا۔ ریس میں شریک کتے کی کمر پر شوخ رنگ کا کپڑا پہنا دیا جاتا ہے جس پر مخصوص نمبر لکھا ہوتا ہے۔ اچانک کمنٹریٹر نے نمبر کے بجائے کمر پر رنگدار پہناوے کو ''واسکٹ'' کہنا شروع کر دیا۔ تقریباً چلانے کے انداز میں: ''نیلی واسکٹ والا آگے، باوا جی! واسکٹ دوسرے نمبر پر اور یہ کالی واسکٹ نے بھی زور لگایا اور سب سے آگے، کمال کر دیا''۔ اور اسی سے ملتے جلتے دیگر فقرے بھی بولتے چلے گئے۔ ہم نے اشاروں سے بات سمجھانے کی کوشش کی تو آواز مزید اونچی کر کے پکارنے لگے: ''تین نمبر واسکٹ سب سے آگے، چھ نمبر واسکٹ مشکل میں ہے''۔ نیچے وی آئی پی سٹینڈ سے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ شکر ہے کہ خاکی رنگ کے پہناوے کے ساتھ کوئی دوڑ میں شریک نہیں تھا ورنہ ہم فورٹریس سٹیڈیم سے سیدھا ملٹری ہسپتال ہی جاتے۔ بہرحال تقریب ختم ہوتے ہی ہماری طلبی ہوگئی۔ اس مرتبہ سول ملٹری کی مشترکہ ڈانٹ ڈپٹ نے دن میں تارے دکھا دیئے، جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت تھی۔ تقریبات میں اکثر صف اول کے مدعوئین کو شلوار، قمیض اور واسکٹ ہی زیب تن کرتے تھے۔ ہمیں وارننگ کے ساتھ یہ مژدہ بھی سنایا گیا کہ واسکٹ والی بات بہت اوپر تک جائے گی، تم اپنی خیر مناؤ۔ میں نے دفتر پہنچتے ہی بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کو روداد سنائی۔ پہلے تو انہوں نے خوب انجوائے کیا، جب قہقہہ ختم ہوا تو فرمانے لگے کہ دیکھو بھئی! ذمہ داری تو آپ کی تھی، اچھا جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب کل کی تیاری کرو اور کمنٹر باکس کو بند کر کے تالا لگا دیا کرو تاکہ سفارشی اندر نہ آئے۔ رات گئے معلوم ہوا کہ کسی وی آئی پی نے کور کمانڈر کو بھی تحریری رپورٹ کی ہے۔ یوں صورتحال بہت سنگین ہے۔ چند روز کھینچا تانی رہی۔ عزیز الرحمٰن کے منظور شدہ اعزازیہ کے حصول میں بھی دشواری آئی۔ معاملے میں ویٹو کور ہیڈ کوارٹرز کے پاس تھا لہٰذا انہیں ادائیگی کر دی گئی۔

کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اسلم شاہ دھیمی طبیعت

جنرل آصف نواز کے ساتھ نوکری میں رٹا رٹایا جواب نہیں چلتا تھا، سچ کہنے میں کافی عافیت تھی اور یہ میرا تجربہ بھی تھا

Scanned with CamScanner

میں نے ایک اور رسک لیا اور چیف کے سامنے رکھا ہوا اخبار اٹھا لیا، جنرل آصف نواز کو اس حرکت کی توقع نہیں تھی

کے حامل تھے۔ کھرے عسکری، معاملہ فہم اور مشفقانہ انداز میں برتاؤ کے قائل تھے۔ ایک روز ابھی میں اخبارات کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دفتر میں ڈائریکٹ فون کی گھنٹی گونجنے لگی۔ یہ ہیڈ کوارٹر کا اندرونی مواصلاتی نظام کا حصہ تھا۔ لائن پر کور کمانڈر تھے۔ پوچھنے لگے کہ کوئی خاص خبر ہے؟۔ میں نے دو تین معمول کی خبریں پڑھنا شروع کیں تو ٹوکا۔ نہیں کوئی اور خبر۔ میں نے کہا کہ نہیں سر۔ دوسری جانب سے آواز آئی۔ کمال ہے مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ آج کی سب سے بڑی خبر یہ ہے کہ فیض احمد فیض گزر گئے۔ آپ میرے دفتر میں آیئے۔ کور کمانڈر کی فیض احمد فیض کی وفات میں دلچسپی سے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ الٰہی ماجرا کیا ہے۔ میں سمجھا کہ شاید دور نزدیک کے رشتہ دار ہوں۔ بہر حال دو تین اخبار تھامے، حاضر ہوا تو بات آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ کے آئی ایس پی آر کے افسر تھے۔ آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ جنازہ میں شرکت کریں۔ میں نے کہا کہ سر! اس معاملہ میں راولپنڈی سے حکم موصول نہیں ہوا۔ دفتری اوقات میں ممکن نہیں۔ میری بات مکمل ہوئی تو کہا کہ میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ میری رائے کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ سر! وردی میں مناسب نہیں ہوگا اور بہتر ہوگا کہ راولپنڈی میں بات کر لیجیے۔ کور کمانڈر کچھ دیر خاموش رہے ”اچھا وردی تبدیل کریں۔ آدھ گھنٹے بعد ہم دونوں پرائیویٹ کار میں ماڈل ٹاؤن لاہور جائیں گے۔ ایک پھولوں کی چادر کا بھی انتظام کریں، قبر پر رکھنے کے لیے“۔

اب یہ ایک نیا امتحان تھا۔ سٹاف کی مدد سے انتظامات مکمل کیے۔ گھر سے شلوار قمیض اور واسکٹ منگوائی۔ کور کمانڈر کے اے ڈی سی نے پرائیویٹ کار کا انتظام کر دیا تھا۔ میں کور کمانڈر کے ہمراہ جی بلاک ماڈل ٹاؤن گراؤنڈ میں تھا۔ ابھی نماز شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم ایک جانب کھڑے تھے۔ میرے کچھ دوست احباب علیک سلیک کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد گورنر پنجاب کے ملٹری سیکرٹری کرنل یعسوب ڈوگر نے جو باوردی تھے مجھے ہاتھ کے اشارے سے طلب کیا۔ مجھے ساکت دیکھ کر وہ خود آگے بڑھے تو کور کمانڈر کو دیکھ کر سیلوٹ کیا اور انہیں پہلی صف میں لے جانے پر اصرار کرنے لگے۔ شرکاء کی اکثریت کے لئے کور کمانڈر اسلم شاہ کو عام لباس میں پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ مجھ سے چند ایک رپورٹرز نے دریافت کیا تو میں نے بتا دیا۔ اگلے روز اخبارات میں کور کمانڈر کی فیض احمد فیض صاحب کے جنازے میں شرکت کی خبریں شائع ہوئیں تو لیفٹیننٹ جنرل اسلم شاہ نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے، میں تو ذاتی حیثیت سے گیا تھا۔

ماڈل ٹاؤن سے واپسی کے دوران کور کمانڈر نے فیض احمد فیض کی شاعری اور زندگی کے بارے میں معلوماتی گفتگو کی۔ میں نے راولپنڈی سازش کیس میں مرحوم کی شرکت کا قصہ چھیڑا تو کہنے لگے

Scanned with CamScanner

کہ شاید: ''محفل آرائی'' کے باعث وہ دھر لئے گئے تھے۔ اصل میں اہم ترین کردار میجر جنرل اکبر خان آزادی کشمیر کے حوالے سے ایک اہم اور نمایاں نام تھا۔ ان سے فیض احمد فیض ملتے جلتے ہوں گے''۔ لیفٹیننٹ جنرل اسلم شاہ نے ریٹائرمنٹ کے بعد راولپنڈی میں سکونت اختیار کی۔ اہم مواقع پر انگریزی اخبارات میں معلوماتی مضامین لکھتے رہے۔ اللہ کریم ان کی مغفرت فرمائیں۔ آمین

لاہور میں سرکاری فرائض کی ادائیگی کے علاوہ ذاتی مصروفیات بھی تھیں۔ اخبارات اور جرائد میں کبھی بغیر کام کے چلے جانا، اپنے کلاس فیلوز اور دوستوں کے ساتھ گپ شپ، عزیز رشتہ داروں سے ملاقاتیں، میل جول وغیرہ۔ سب سے بڑھ کر والدین اور بھائی بہن ماڈل ٹاؤن میں مقیم تھے۔ ان کے ہاں بھی کبھی تنہا اور اکثر اپنی فیملی کے ہمراہ حاضری ایک مستقل فریضہ تھا۔ عموماً نماز جمعہ والد گرامی کے ہمراہ ماڈل ٹاؤن ہی میں ادا کی جاتی تھی۔ لاہور آئے ابھی ایک برس ہی ہوا تھا کہ والدہ محترمہ شدید علیل ہوگئیں۔ بہت تاخیر سے ذیابیطس تشخیص ہوئی۔ چند ماہ کی مسلسل علالت کے بعد انتقال فرما گئیں۔ یہ میرے لیے شدید جذباتی دھچکا تھا۔ انہیں جی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد کافی عرصہ تک مجھے پیدل سڑک پار کرنے میں دشواری کا سامنا رہا۔ دور سے آتی ہوئی گاڑی اپنے قریب محسوس ہوتی تھی۔ یوں سڑک پر بے چارگی کے عالم میں کھڑا رہتا تھا۔ کسی نے گلبرگ لاہور کے ایک ڈاکٹر کا ایڈریس دیا۔ ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ آپ والدہ کے انتقال کے بعد شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہوگئے ہیں۔ انہوں نے کچھ ادویات اور چند مشورے دیئے۔ بہرحال زندگی کے معمول پر آنے میں کچھ وقت لگا تاہم والدہ کی کمی آج بھی روز اول کی مانند محسوس ہوتی ہے۔

لاہور میں مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے آفس کا بھی دس پندرہ روز کے بعد چکر لگتا رہتا تھا۔ اب یاد نہیں کہ شامی صاحب کے جریدہ ''بادبان'' میں کالم لکھنے کا خیال کیسے آیا کہ قلمی نام سے مہینے میں دو تین کالم شائع ہونا شروع ہوگئے۔ عنوان تھا'' تادم تحریر'' اور قلمی نام رضی بن رفاقت تھا۔ رضی کے نام سے والدین اور قریبی عزیز بلاتے تھے اور رفاقت میرے والد گرامی کا نام تھا۔ یہ راز صرف شامی صاحب ہی کو معلوم تھا۔ کبھی کبھار شائع شدہ متن میں ''گڑبڑ'' ہو جاتی تو شامی صاحب سنبھال لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جنرل محمد ضیاء الحق لاہور تشریف لائے۔ ان کے چند روزہ دورے میں فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (رشید صدیقی گروپ) کی تقریب میں شرکت میں شامل تھے۔ دراصل صحافتی یونینز دو تین گروپوں میں تقسیم تھیں۔ ایک کی قیادت رشید صدیقی کر رہے تھے، اس گروپ کے متحرک اراکین میں چودھری غلام حسین اور شاہد اسلم شامل تھے۔

شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے دوران کسی کو پہاڑ کی چوٹی پر جنات دکھائی دیتے تو کوئی دریا کنارے پریوں کے وجود کی قسمیں اٹھاتا دکھائی دیتا تھا جنات اور پریوں کے وجود کا احساس دراصل آکسیجن کی کمی کے باعث رونما ہوتا ہے

Scanned with CamScanner

ایم کیو ایم وقت گزرنے کے ساتھ لسانی بنیاد پر شہری سندھ کی مضبوط، توانا اور ناقابل چیلنج سیاسی حقیقت کا روپ دھار چکی تھی

دوسرا بااثر گروپ منہاج برنا سے منسوب تھا۔ اس میں نثار عثمانی ایسے سرکردہ صحافی شامل تھے۔ رشید صدیقی نے جنرل محمد ضیاء الحق کو الحمراء آرٹس کونسل کے وسیع و عریض ہال میں خطاب کی دعوت دی تھی جس کو بھرنے کے لیے غیر صحافتی افراد کو بھی مدعو کیا گیا۔ میں اور بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی ایسے ہی غیر صحافتی افراد کی صف میں بیٹھے تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مصروفیات کے باعث تاخیر سے تقریب میں پہنچے تو ہال تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھا۔ ایک دو مقررین نے مہمان خصوصی کی تاخیر سے آمد کو بھی موضوع بنایا۔ ایک صاحب نے یہاں تک کہہ دیا کہ آپ کے انتظار میں ہم پیشاب تک روکے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ ہمارے قائد رشید صدیقی کسی کو ہال سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہے۔ بہر حال تقریب ختم ہوئی۔ میں نے اگلے روز ایک کالم جسے مزاحیہ ہی کہا جا سکتا تھا لکھ کر مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس کالم میں تقریب کے حوالے سے بقول شخصے ''غیر سنجیدہ'' سطور رقم کی گئی تھیں۔ چند جملے میزبان اور کچھ مہمان خصوصی کے شایان شان نہیں تھے۔ ''بادبان'' کا شمارہ شائع ہوا تو میرے کالم کے حوالے سے صحافتی حلقوں میں ''آہ وفغاں'' سنائی دینے لگی۔ دراصل منہاج برنا اور نثار عثمانی کے ہم نوا صحافیوں نے کالم کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں وسیع پیمانے پر تقسیم کیں۔ اب رشید صدیقی کے ساتھی ''رضی بن رفاقت'' کی تلاش میں تھے۔ کسی طور کھرا مجھ تک پہنچ گیا۔ انہوں نے بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی اور کرنل صدیق سالک (بعد میں بریگیڈیئر) کو میری شکایت کی اور کالم کو جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصیت پر براہ راست حملہ قرار دے دیا۔ مجھے تفضّل حسین صدیقی نے راولپنڈی سے کال کی اور کالم کے بارے میں افواہوں کی تصدیق چاہی۔ بریگیڈیئر انتہائی نستعلیق اور رکھ رکھاؤ والی شخصیت تھے۔ کہنے لگے کہ ''یہ کالم آپ نے لکھا ہے؟''۔ میں نے بھی احترام کے ساتھ عرض کی کہ ''سر! آپ سرکاری طور پر پوچھ رہے ہیں؟'' فرمایا: ''جی۔ سرکاری طور پر ہی پوچھ رہا ہوں۔ معاملہ بہت سیریس ہے''۔

میرا جواب تھا کہ ''سر! یہ میں نے نہیں لکھا۔ کسی رضی بن رفاقت کی تحریر ہے''۔ ان کی آواز گونجی ''سید صاحب سنیے، ذاتی طور پر بتائیے''۔ یہ مختلف انداز تھا۔ میں نے فوراً اقرار کیا اور کہا کہ سر! آپ کو یاد ہوگا کہ ہال میں کیسی گفتگو ہو رہی تھی۔ کیا وہ سب کچھ مہمان خصوصی کے شایان شان تھا؟۔ بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی نے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے صدر مملکت کو مشورہ دیا تھا کہ وہ صحافیوں کے ایک گروپ کی تقریب میں شرکت نہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔ تھوڑی دیر بعد صدر مملکت کے پریس سیکرٹری صدیق سالک فون پر تھے۔ ''میجر صولت رضا، آپ نے تو کمال کر دیا۔ امام (جنرل ضیاء الحق) نے بھی پڑھا ہے اور محظوظ ہوئے ہیں''۔

Scanned with CamScanner

میں چند روز ڈپریشن اور گومگو کی حالت میں رہا۔ دس پندرہ روز کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق دوبارہ لاہور آئے۔ میں بھی آئی ایس پی آر ٹیم کے ہمراہ ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ صحافیوں میں چودھری غلام حسین بھی دکھائی دے رہے تھے۔ علیک سلیک ہوئی۔ اتنے میں جنرل ضیاء الحق آ گئے۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر کہنے لگے: 'چودھری صاحب آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے پاس وردی میں بھی کالم لکھنے والے موجود ہیں''۔

یہ ذومعنی جملہ سن کر میں نے باوردی سول کالم نگاری سے توبہ کر لی۔ یہ حقیقت ہے جنرل محمد ضیاء الحق مارشل لاء حکمران ہونے کے باوجود کافی حد تک آزادی اظہار برداشت کرتے تھے۔ اخبارات اور کتب کا مطالعہ ان کی عادت ثانیہ تھی۔ یوں ان میں ایک بااخلاق سامع کی خصوصیات بھی موجود تھیں۔ انہیں بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی اور بریگیڈیئر صدیق سالک کی صورت میں اعلیٰ پائے کے صحافتی اور ادبی پس منظر رکھنے والی شخصیات کی مخلصانہ آراء سے مستفید ہونے کا موقع بھی ملتا تھا تاہم وہ خود بھی فن ابلاغ کے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں عسکری، سیاسی اور ابلاغی محاذ پر منفرد کارنامے انجام دیئے جنہیں محض مارشل لاء حکومت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے سانحہ بہاولپور کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق کے ''غیر سیاسی'' کارنامے پس پردہ چلے گئے۔ میاں محمد نواز شریف نے جنرل محمد ضیاء الحق کے سیاسی ورثے کو اپناتے ہوئے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ عرصے سے انہوں نے دیگر آرمی چیفس کیساتھ اپنے مربی اور محسن کو بھی آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بیرونی محاذ پر بھارت جنرل محمد ضیاء الحق سے سب سے زیادہ خائف تھا۔ شاید ان کے پاس پاک افواج کی تیاری کے حوالے سے رپورٹس موجود ہوں گی۔

افغانستان میں سوویت یونین کی براستہ پاکستان شکست کے بعد بھارت کو اندیشہ تھا کہ اب ''تربیت یافتہ'' مسلمان جتھے کشمیر سمیت متعدد ریاستوں کو بھی آزاد کرائیں گے یا کم از کم بھارت کے زیر اثر نہیں رہنے دیں گے۔ بنگلہ دیش میں بھی اس حوالے سے خوش آئند سیاسی اور عسکری تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ڈھاکہ میں پاکستان کا اثر و نفوذ بڑھ رہا تھا۔ بھارت میں سکھ برادری کے ساتھ جنونی ہندوؤں نے جو کچھ کیا، اس کے اثرات بھارت کے حق میں نہیں تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق خطے کی صورتحال کا مکمل ادارک رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے متعدد بار پاک افواج کی تربیتی مشقوں کے معائنہ کے بعد افسروں اور جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ ''ہم نے سقوط ڈھاکہ کا بدلہ لینا ہے۔ آج نہیں تو کل، اور کل نہیں تو پرسوں، یہ ہو کر رہے گا۔ اور بھارت کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے گا جو اس نے ہمارے ساتھ مشرقی

ایک سیدھا سادہ پریس ریلیز جو زیادہ سے زیادہ آئی ایس پی آر اور وزارتِ داخلہ کے پی آر او کے باہمی اشتراک سے جاری ہونا تھا، 1973ء کے آئین کے تناظر میں آرمی چیف اور وزیراعظم سے ہوتا ہوا صدر مملکت تک پہنچا

Scanned with CamScanner

مجھے آج بھی دو آرمی کیپٹن کی نعشیں یاد ہیں
جنہیں بھارت کے تربیت یافتہ دہشت گردوں نے
اغواء کر کے ٹارچر کیا اور پھر انہیں شہید کر دیا

پاکستان میں کیا''۔

انہوں نے علمی سطح پر بھی سٹیک ہولڈرز کو مطمئن رکھنے کی پالیسی اختیار کی ہوئی تھی۔ یوں پاکستان کو معاشی، سیاسی اور عسکری شعبوں میں مدھم ہی سہی تاہم تسلسل کے ساتھ آگے بڑھنے کے مواقع میسر تھے۔ میں آج بھی سمجھتا ہوں کہ جنرل محمد ضیاء الحق کو منظر سے ہٹانے میں دشمن کا ہاتھ تھا۔ ایسے قتل عموماً اس انداز میں کئے جاتے ہیں کہ لہو کی لکیر تک باقی نہیں رہتی۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

بات لاہور سے شروع ہوئی اور جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصیت، کارنامے اور سانحہ بہاولپور کا ذکر درمیان میں آ گیا۔ ان کی قومی خدمات کو محض ''مارشل لاء حکمران'' کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لاہور میں فرائض منصبی معمول کے مطابق جاری تھے۔ زندہ دلوں کے شہر میں چھ برس سے زائد ہو گئے تھے۔ کسی اور شہر میں پوسٹنگ کی آرزو تھی، نہ ہی امید۔ ہمارا ابھی لاہور سے جی بھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز بریگیڈیئر صدیق سالک کی کال آئی کہ آپ گورنر ہاؤس لاہور تشریف لائیے، ضروری بات ہے۔ وہ جنرل ضیاء الحق کے ساتھ لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں سمجھا کہ رات گئے کوئی ابلاغی ڈیوٹی ہوگی یا تقریر وغیرہ کے لیے ٹاکنگ پوائنٹس کی تیاری ہو سکتی ہے۔ بھاگم بھاگ پہنچا تو مغرب ہو چکی تھی۔ بریگیڈیئر صدیق سالک لاؤنج میں بیٹھے اخبارات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ''آپ نے کل کراچی جانا ہے دو تین ہفتے کے لئے۔ پھر ہم مستقل انتظام کر لیں گے''۔ انہوں نے رسمی گفتگو میں وقت ضائع کیے بغیر بات واضح کر دی۔ میں حیران ہوا۔ کراچی میں ہمارے ایک کہنہ مشق ساتھی میجر بشیر کیانی بخیر و خوبی اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سالک صاحب نے بتایا کہ پی آر او آفس کی گاڑی میں ایک کلرک ملٹری ڈیری فارم سے دودھ کے کوپن خریدنے گیا تھا۔ گاڑی ڈیری فارم کے گیٹ پر دودھ تقسیم کرنے والے سرکاری خچر ریڑھے سے جا ٹکرائی۔ خچر زخمی ہو گیا اور اس بنیاد پر انتہائی اہم اور فوری رپورٹ جاری کی گئی ہے۔ کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل احمد شمیم خان نے واقعہ کا نوٹس لیتے ہوئے آئی ایس پی آر افسر کو کراچی سے فوری تبدیل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

اس وقت بریگیڈیئر صدیق سالک ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ بریگیڈیئر تفضل حسین صدیقی مدت ملازمت پوری کر کے ریٹائرڈ ہو گئے تھے۔ قصہ مختصر، زبانی آرڈر لے کر گھر واپس آیا تو اہلیہ نے پوچھا خیریت سے طلبی ہوئی تھی؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''میرا لاہور گوا چا''۔ میری اہلیہ کا تعلق لطیف آباد حیدر آباد سے ہے، لہٰذا انہیں کراچی جانے کی خوشی تھی۔ بہر حال حکم کی تعمیل میں اگلی شب کراچی ایئر پورٹ کے باہر کھڑا گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ میجر بشیر کیانی

Scanned with CamScanner

نے ہلکے پھلکے انداز میں واقعہ کی تفصیل بیان کی اور میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ کراچی میرے لیے انجان شہر نہیں تھا۔ روشنیوں کا شہر ہمارے قائداعظم کا شہر۔ میرا بچپن، لڑکپن اسی شہر میں بسر ہوا تھا۔ اب بھی لاتعداد رشتہ دار، دوست احباب اور خیر خواہ اس شہر میں مستقل رہائش پذیر ہیں۔ یہ سوچ کر دل کو تسلی دیتا ہوا آفس میں حاضر ہوگیا۔ لیفٹیننٹ جنرل احمد شمیم خان کی شہرت ایک سخت گیر اور عسکری نظم وضبط کے پابند کمانڈر کی تھی۔ ان سے پہلی رسمی ملاقات یک طرفہ ہی تھی۔ دراصل کراچی کور کے چیف آف سٹاف بریگیڈیئر ظفر اقبال قریشی لاہور میں بریگیڈیئر کمانڈر رہ چکے تھے۔ مجھے جانتے تھے لہٰذا انہوں نے کور کمانڈر کو بریف کر دیا تھا۔ دو تین دن ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ ویسے بھی عارضی ڈیوٹی پر تھا۔ ایک روز کراچی کے اخبارات سے اپنی دانست میں اہم خبریں اور کالم وغیرہ ایک فائل میں پریس بریف لکھ کر کور کمانڈر کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ چند روز کے بعد حکم ملا کہ نو بجے پریس بریف کی فائل کے ساتھ خود حاضر ہوا کرو۔ یوں اخبارات کے ساتھ کراچی کور کی ''ہائی کمان'' سے بھی براہ راست علیک سلیک کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چند روز بعد وزیراعظم محمد خان جونیجو کوٹری کے قریب تربیتی مشقیں دیکھنے آرہے تھے۔ یہ پہلا امتحان تھا۔ کور کمانڈر کی خواہش تھی کہ بھرپور کوریج ہونی چاہیے۔ اس زمانے میں صرف پی ٹی وی کا نیوز بلیٹن ہی نوکری بنانے یا بگاڑنے کا سبب ہوتا تھا۔ اخبارات میں کوریج کا وزن علیحدہ تھا۔ بہرحال ٹیم کے ساتھ کوٹری پہنچا۔ وزیراعظم تشریف لائے اور ایک ٹینک نما گاڑی میں سوار ہوکر مشقوں کا معائنہ کیا۔ ہمارے کیمرہ مین اور فوٹوگرافر چابکدستی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے پی ٹی وی پر سپیشل رپورٹ کے لئے ان کے پریس سیکرٹری سید انور محمود سے سفارشی رقعہ لیا اور واپس کراچی روانہ ہوگیا۔ اس روز وزیراعظم جونیجو کی اور بھی بہت سی مصروفیات تھیں۔ سید انور محمود کی چند سطور نے کام دکھایا جس میں وزیراعظم کی خواہش کا ذکر تھا۔ رات خبرنامہ کے بعد پی ٹی وی پر نصف گھنٹہ کی سپیشل رپورٹ آرمی کی تربیتی مشقوں کے بارے میں تھی۔ رپورٹ کیا ٹیلی کاسٹ ہوئی، کور کمانڈر نے بھرپور شاباش کے ساتھ آئی ایس پی آر ٹیم کو نقد انعام سے بھی نوازا۔

اس اعلیٰ کارکردگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے کراچی کے ساتھ آئی ایس پی آر افسر کے طور پر مستقل تعینات کر دیا گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل احمد شمیم خان کا عرصۂ کمانڈ نسبتاً پرسکون ہی رہا۔ ہفتے میں اکا دکا واقعات رپورٹ ہوتے تھے۔ ظاہر ہے صوبہ سندھ سے اطلاعات موصول ہوتی رہتی تھیں۔ پنو عاقل چھاؤنی کی تعمیر کے حوالے سے معاملات زیر بحث رہتے تھے۔ اس کے علاوہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر ایک ایسا موضوع تھا جس پر سندھ کے بعض رہنما تو تکار پر اتر آئے تھے۔ بدقسمتی سے فنی نالج بہت کم تھا، صرف

سیاستدانوں کی باہمی ریشہ دوانی اور سطحی سوچ

کے باعث آپریشن کے حوالے سے

فوج دباؤ کا شکار رہی

Scanned with CamScanner

جماعت اسلامی ایم کیو ایم سے سیاسی زک اٹھانے کے باعث گوشہ تنہائی میں تھی

محض اکا دکا بیانات سے سیاست چل رہی تھی

ایک نان ایشو ہی کو ایشو بنا لیا گیا تھا۔ سندھی زبان میں شائع ہونے والے اکثر اخبارات اور جرائد بھی اس حوالے سے یکطرفہ مضامین ہی شائع کرتے تھے۔ کبھی کبھار صوبے کے مسائل پر سندھی اخبارات یکساں اداریہ بھی شائع کرتے تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل احمد شمیم خان مدت ملازمت مکمل کر کے راولپنڈی روانہ ہوگئے اور ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کو تعینات کر دیا گیا۔

لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کو راولپنڈی میں قیام کے دوران جوائنٹ سروسز ہیڈ کوارٹر میں دیکھا تھا۔ تب وہ فل کرنل یا بریگیڈیئر تھے اور جنرل رحیم الدین خان سینئر سٹاف افسر تھے۔ انہوں نے چارج سنبھالتے ہی انفرادی ملاقاتیں اور زیر کمان یونٹس کے دورے شروع کر دیئے۔ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کرکٹ کے شیدائی تھے، خود بھی ہفتے میں ایک دو بار سپورٹس کٹ میں گراؤنڈ میں نظر آتے تھے۔ باؤلنگ نامور فاسٹ باؤلر فضل محمود کی مانند کرتے تھے۔ واک وغیرہ اس کے علاوہ تھی۔ انہیں بے جا پروٹوکول سے بھی ''عقیدت'' نہیں تھی۔ گھر سے صرف ایک سٹاف کار، ساتھ ملٹری پولیس کی جیپ اور کوئی ہٹو بچو کی صدا نہیں ہوتی تھی۔ راستے میں تمام ٹریفک سگنلز پر کار رکتی تھی۔

شاہراہ فیصل پر ملٹری پولیس جنرل ضیاء الحق کے موقع پر دکھائی دیتی تھی۔ سانحہ بہاولپور کے موقع پر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کور کمانڈر کراچی تھے۔

مجھے یاد ہے کہ سہ پہر کے وقت مجھے زاہد حسین (سینئر رپورٹر) روزنامہ جنگ کی کال آئی اور پاکستان ون ایئر کرافٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ مجھے صحیح صورتحال کا علم نہیں تھا۔ آئی ایس پی آر فون کیا تو پتہ چلا کہ بریگیڈیئر صدیق سالک بھی جنرل محمد ضیاء الحق کے ہمراہ بہاولپور کے قریب عسکری مشقوں کے علاقے میں ہیں۔ کچھ دیر بعد کور ہیڈ کوارٹرز سے ہدایت آئی کہ فوراً آفس پہنچیں۔ کور کمانڈر بھی اپنے آفس میں موجود تھے۔ سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا، حکم ملا کہ تمام افسر اپنے دفاتر میں موجود رہیں اور لائٹس آف نہیں کی جائیں گی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی المناک رحلت پر پوری قوم اور خاص طور پر افواج پاکستان حد درجہ سوگوار تھیں۔ باوردی افراد ہی جنرل محمد ضیاء الحق کی عسکری خدمات کا صحیح ادارک کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ غیر فوجی افراد بھی انہیں عقیدت کے ساتھ یاد کر رہے تھے۔ رات گئے تک لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز اپنے آفس میں مقیم رہے۔ ظاہر ہے ہمیں بھی ڈیوٹی پر رہنا تھا۔ خواہ رات ایسے ہی بیت جائے۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی رحلت کے بعد وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ آرمی چیف تعینات ہو گئے۔ صدر مملکت کا عہدہ جناب غلام اسحاق خان نے سنبھال لیا۔ عام انتخابات قریب آ گئے۔ کراچی میں مقامی جماعتوں نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ الطاف حسین کی زیر قیادت ایم کیو ایم خاص

Scanned with CamScanner

طور سے سرگرم تھی۔ان کے کارکنان اپنے اپنے علاقوں میں سیاسی کم انتقامی روپ میں زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔اس طرز عمل سے دیگر سیاسی جماعتیں خاص طور سے پاکستان پیپلز پارٹی سب سے زیادہ مشتعل تھی۔ الزام تھا کہ ایم کیو ایم ''سرکاری سرپرستی'' میں کراچی، حیدرآباد اور دیگر بڑے شہروں میں پیپلز پارٹی کی برتری کو چیلنج کر رہی ہے۔خاص طور سے لسانی تفریق کی بنیاد پر اقدامات کیے جارہے ہیں۔متعدد بار امن وامان کے مسائل پیدا ہوئے۔فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کے لیے طلب کیا گیا۔اندرون سندھ سے تعلق رکھنے والے قوم پرست سندھی بعض اوقات پیپلز پارٹی کے کندھے پر بندوق رکھ کر مخالفین کو زک پہنچاتے تھے۔لسانی بنیاد پر لڑائی جھگڑے معمول بن گئے۔ خاص طور سے تعلیمی اداروں میں یہ روگ پریشان کن حد تک سرایت کر گیا تھا۔پیپلز پارٹی میں تقریباً تمام لسانی اکائیوں کی نمائندگی تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کے دور میں سندھ کے شہروں میں بڑھتے ہوئے تشدد کی روک تھام کے لیے متعدد اقدامات کئے گئے۔ کور ہیڈ کوارٹرز میں سیاسی رہنماؤں کی آمدورفت بڑھ گئی۔

کراچی میں اے پی ایم ایس او (آل پاکستان مہاجر سٹوڈنٹس آرگنائزیشن) اور پی ایس ایف (پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن) کی باہمی آویزش سے تعلیمی اداروں کا ماحول پراگندہ ہو چکا تھا۔ایک مرحلے پر دونوں تنظیموں نے ایک دوسرے کے حامی اور سرکردہ نوجوانوں کو اغواء کرنا شروع کر دیا۔اغواء کنندگان کو مخصوص ٹارچر سیلز میں پہنچایا جاتا تھا جہاں انتہائی اذیت کے لیے ساز و سامان موجود تھا۔شہر میں آہ و بکا مچی ہوئی تھی۔والدین اور اساتذہ سخت پریشان تھے۔اس مرحلے پر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز نے سول انتظامیہ کی امداد کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں متحارب گروپوں اور ان کی سرپرست سیاسی جماعتوں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے سینئر رہنماؤں کو کم از کم ''زخمی قیدیوں'' کے تبادلے پر آمادہ کر لیا۔ اس نیک کام کے لئے آئی ایس پی آر آفس کے سامنے پارکنگ کی جگہ منتخب کی گئی۔

اس سے قبل رات بھر مذاکرات ہوتے رہے۔ شرائط پیش ہو رہی تھیں۔یقین دہانیاں مانگی جارہی تھیں،کور کمانڈر نے بات چیت کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے بریگیڈیئر معید کو ذمہ داری دے دی تھی۔میں بھی بھاگ دوڑ میں مصروف تھا، کیونکہ پریس کو خبر مل گئی تھی کہ کور ہیڈ کوارٹرز میں رات گئے لائٹس آن ہیں۔ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کی سینئر قیادت جمع ہے۔اس زمانے میں موبائل فون کی افراط نہیں تھی، پیغام رسانی کے لیے ''پیجر'' استعمال ہوتے تھے۔میں نے فجر تک تو ''نو کمنٹس'' سے کام چلایا۔ چند ایک کی منت سماجت کی۔ اگلے روز صبح کے اخبارات میں چونکا دینے والی خبر تھی۔ اس دوران حتمی تحریری معاہدہ تیار ہو گیا۔ دونوں مقبول

میجر احتشام سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو موصوف پولیس کی وردی میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، میں نے رائے دی کہ پولیس کے ساتھ مختصر وقت گزارنا ورنہ کسی کے نہیں رہو گے

Scanned with CamScanner

میں نے احتشام کو مشورہ دیا کہ پنجاب پولیس سے بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ، سندھ کی ''سائیں پولیس'' کے ساتھ ''تعلقات عامہ'' استوار ہو گئی تھی، پنجاب پولیس سے انگریز بھی پناہ مانگتا تھا

سیاسی جماعتوں کے سینئر رہنما آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے میرے دفتر میں جمع ہو گئے۔ جہاں ان کے لیے گرما گرم ناشتہ تیار تھا۔ ان رہنماؤں میں پیپلز پارٹی کے راشد ربانی صاحب اور ایم کیو ایم کے ایم این اے اسلم صاحب تھے۔ یہ شخصیات آج دنیا میں نہیں ہیں۔ اللہ مغفرت فرمائیں۔ آمین

معاہدے کے مطابق ''زخمی قیدی'' کور ہیڈ کوارٹرز پہنچنا شروع ہو گئے۔ میرے کولیگ مسرور عباس جعفری فوٹو گرافر نے ریکارڈ کے لیے تصاویر اتارنا شروع کر دیں۔ پہلے اعتراض ہوا کہ یہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہے لیکن سورج نکل چکا تھا اور باوردی فوجی بھی ارد گرد دکھائی دے رہے تھے۔ لہٰذا احتجاج خود بخود دم توڑ گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز نے دفتر طلب کر کے کہا ''پی آر او! کوئی خبر، تصویر وغیرہ اخبار میں نہیں آنی چاہیے''۔ یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے رہائش گاہ پر چلے گئے۔ رات بھر جاگتے رہے۔ صبح کے اخبار جماعتوں کے ''قیدیوں'' کے تبادلے کی خبر سے خالی تھے۔ اب کراچی کے شام کے اخبارات کی باری تھی جو دوپہر تک شائع ہو جاتے تھے۔ میں نے ازخود خبر تیار کی اور چند تصاویر کے ساتھ صرف ''قومی اخبار'' تک پہنچا دی۔ یہ کراچی کا مقبول ترین شام کا اخبار تھا۔ الیاس شاکر صاحب اور مختار عاقل کی ادارت میں یہ اخبار شائع ہوتا تھا۔ چند گھنٹوں بعد چیختی، چنگھاڑتی سرخیوں کے ساتھ اخبار جب عام ہوا تو کراچی دم بخود رہ گیا۔

روشنیوں کے شہر میں سیاست کے نام پر اس قدر نفرت آمیز واردات جس کے باعث سینکڑوں نوجوان زندہ نہ مردہ حالت میں ہسپتالوں میں کراہ رہے تھے۔ ایم کیو ایم اپنے زخمیوں کو عباسی شہید ہسپتال اور پیپلز پارٹی نے قریب ہی جناح ہسپتال کا رخ کیا۔ میں نے تمام زخمی نوجوان طالب علموں کو اپنے دفتر کے سامنے پارکنگ ایریا میں اترتے دیکھا تو کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ایسا ہولناک منظر شاید کبھی دیکھا ہو۔ زیادہ تر اردو بولنے والے بچے تھے۔ ایم کیو ایم کے علاوہ کچھ پیپلز پارٹی کی ذیلی تنظیم پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن تھے۔ چند ایک کے مخصوص اعضاء مخالفین نے ٹارچر سیل میں ڈرل کر دیئے تھے۔ اس کے علاوہ مخالف کی کمر اور چھاتی پر ڈرل مشین سے من پسند تنظیم کا نام کندہ کر دیا۔ اس عمل سے تکلیف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شام کے اخبار ''قومی اخبار'' میں خبر کی اشاعت کو بات چیت میں شریک سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنے والے فوجی افسروں نے پسند نہیں کیا۔ اب میری ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دوڑ لگ گئی۔ میں سکھلائے ہوئے طریقہ کار کے مطابق ''سر! چیک کرتا ہوں'' کی گردان جاری کئے ہوئے تھا۔ کچھ دیر بعد کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کے آفس میں طلبی ہو گئی۔ کور ہیڈ کوارٹرز کے سینئر افسر بھی موجود تھے۔ میں پہنچا تو فضا ''ابر آلود'' تھی۔ ظاہر ہے کہ

سب متفق تھے کہ میجر صولت رضا نے خبر رکوانے کا فرض دیانت داری سے ادا نہیں کیا۔ جنرل آصف نواز نے ذرا تلخ اونچی آواز میں کہا ''پی آر او! یہ سب کیا ہے؟''۔ میرا جواب واضح تھا کہ ''سر! یہ خبر میں نے تصویروں کے ساتھ خود پہنچائی ہے''۔ کور کمانڈر نے سوال کیا ''کوئی ٹھوس دلیل؟''۔ میں نے جواب دیا ''سر! یہ میرا ایک پروفیشنل کے طور پر آرمی کے امیج کی سربلندی کی خاطر مناسب فیصلہ تھا۔ تشدد اور لاقانونیت میں ملوث افراد اور گروہوں کی پردہ پوشی بھی شریک جرم ہونے کے مترادف ہوگی۔ دونوں جماعتوں کے بات چیت میں شریک رہنماؤں نے میرے دفتر میں پرتکلف ناشتہ کیا ہے۔ آپس میں دوستانہ ہنسی مذاق دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ دو تین روز کے وقفے سے ان دونوں جماعتوں نے یہ سانحہ بھی فوج کے ذمہ ڈال دینا ہے کیونکہ بچے ہمارے عقوبت خانوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ ہم نے کور ہیڈ کوارٹرز سے اٹھائے ہیں وغیرہ وغیرہ''۔ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز نے میری معروضات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ''ٹھیک ہے خبر روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ تم نے درست فیصلہ کیا ہے۔ حقیقت لوگوں کے سامنے آنی چاہیے''۔

میٹنگ برخاست ہوگئی۔ میں اپنے آفس واپس پہنچا ہی تھا کہ رپورٹرز کی یلغار ہوگئی اور اگلے روز صبح کے اخبارات سیاسی جماعتوں کی ذیلی تنظیموں کے کارہائے نمایاں سے بھرے ہوئے تھے۔ اداریے اور کالم اس کے علاوہ تھے۔ شہر کی صحافت ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی سے لرزہ براندام تھی لیکن مذکورہ ٹارچر سیل کے حوالے سے خبروں کی اشاعت کے لیے صحافیوں کی استقامت قابل تحسین تھی۔

سانحہ بہاولپور کے بعد پاک فوج کی کمان جنرل مرزا اسلم بیگ نے سنبھال لی تھی۔ سینٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان صدر مملکت کے عہدے پر متمکن ہوگئے۔ عام انتخابات کی تیاری عروج پر تھی اور تمام سیاسی جماعتیں کمر کس رہی تھیں۔ ایسے عالم میں سندھ کی سیاست میں الاؤ روشن ہونا شروع ہو گئے۔ متعدد لسانی، نظریاتی، علاقائی اور فقہی دائرے پھیلتے اور ایک دوسرے میں ضم ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ کراچی میں الطاف حسین کی ''زیر نگرانی'' ایم کیو ایم ہر لحاظ سے سیاسی اور انتظامی پنجے گاڑھ چکی تھی۔ تعلیمی اداروں کی دیواریں اور کلاس رومز میں ''مہاجر سیاست'' کا بول بالا تھا۔ دوسری جانب سندھی بلوچی پنجابی اور پختون اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے کارنر میٹنگز وغیرہ کر رہا تھا۔ پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کی سیاست کے منفرد انداز تھے۔ ان جماعتوں کے اجتماعات میں لسانی یا فرقہ وارانہ نمودو نمائش نہیں تھی۔ پیپلز پارٹی کراچی اور دیگر شہری علاقوں میں اپنا ''سراپا'' غیر لسانی رکھتی ہے تاہم سندھ کی حد تک بھرپور سندھی دکھائی دینا سیاسی ضرورت بھی ہے۔ یہ کیفیت اندرون سندھ

احتشام تعزیرات پاکستان کی زد میں آ گیا

مدت تک قید و بند کی صعوبت برداشت کی

سیاستدان ہوتا تو یہ بات کریڈٹ میں جاتی

Scanned with CamScanner

کراچی آپریشن کے حوالے سے بھی خفیہ رپورٹس مل رہی تھیں کہ امن دشمن بھارت کی اعانت سے آرمی کی سینئر قیادت کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں

کے ووٹر کو پارٹی نشان ''تلوار'' یا ''تیر'' کے ساتھ منسلک رکھتی ہے اور وہ آنکھ بند کر کے ''ٹھپہ'' لگا دیتا ہے۔ کراچی اور حیدر آباد میں خاص طور سے تناؤ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے بالخصوص آرمی اندرونی سلامتی کی ڈیوٹی کی بنیاد پر کسی ناگہانی صورتحال اور شورش کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ متعدد بار سندھ کے دورے پر آئے۔ انہوں نے کراچی، حیدر آباد اور دیگر مقامات پر تعینات جوانوں سے ملاقات کی اور خطابات کیے۔ انہیں دھیمے لہجے میں سخت بات کہنے کا ملکہ حاصل ہے۔ ان کی پیشہ وارانہ امور پر گفتگو بھی عالمی تناظر میں ہوتی ہے۔ ان کے دور میں ''ضرب مومن'' نامی بھرپور عسکری مشق کی بدولت پاک افواج کے پیشہ وارانہ امیج کو مہمیز ملی۔ مشن میں شریک افسروں اور جوانوں کی صلاحیت، اہلیت اور اعتماد میں قابل تحسین حد تک اضافہ ہوا۔ آرمی چیف نے مشق کے دوران اپنی تقاریر میں ''دشمن'' اور پاکستان کے بدخواہوں کو واضح پیغام دیا کہ کسی قسم کی ''نان سینس'' برداشت نہیں کی جائے گی۔ ''ضرب مومن'' کی ایک بات یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کے سینئر اور نوجوان نمائندگان کی بھرپور شرکت تھی۔ اس حوالے سے آئی ایس پی آر نے اپنے سربراہ بریگیڈیئر ریاض اللہ کی زیر صدارت وسیع انتظامات کیے تھے۔ بریگیڈیئر صدیق سالک کی سانحہ بہاولپور میں شہادت کے بعد جنرل مرزا اسلم بیگ نے انفینٹری رجمنٹ کے بریگیڈیئر ریاض اللہ کو آئی ایس پی آر کا ڈائریکٹر مقرر کیا۔ یہ ایک غیر متوقع فیصلہ تھا جبکہ فوج میں ''لنگر گپ'' کچھ اور تھی۔

یہاں بتاتا چلوں کہ آئی ایس پی آر سربراہ بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کی ریٹائرمنٹ کے بعد بریگیڈیئر صدیق سالک نے ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کا چارج سنبھالا تو میں اس وقت آئی ایس پی آر لاہور میں تعینات تھا۔ پورے دفتر میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ یہ کیفیت غیر متوقع نہیں تھی، سٹاف کو معلوم تھا کہ مزاج یار پچپن سے ''عاشقانہ'' ہے۔ میرے ایک رفیق کار نے راولپنڈی سے کانپتی ہوئی آواز میں اطلاع دی کہ بریگیڈیئر سالک نے آئی ایس پی آر کی کمان سنبھال لی ہے اور انہوں نے بڑے سخت احکامات جاری کیے ہیں۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ ابھی یہ احکامات لاہور نہیں پہنچے'' میرا جواب سن کر موصوف بولے ''آپ خوش نہ ہوں۔ عن قریب ریجنل دفاتر کی شامت آنے والی ہے''۔ میں نے جواب دیا کہ بھائی ہمارا کیا ہے، پہلے ایک گگلی بالر کا سامنا کرتے رہے۔ اب فاسٹ بالر آ گیا ہے تو سر پر ہیلمٹ پہن لیتے ہیں اور باہر جاتی ہوئی تیز گیند سے فاصلہ رکھیں گے۔ دو چار روز کی بات ہے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا''۔ اگلے روز ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے صبح ڈائریکٹر کے پی اے کی فون پر آواز سنائی دی: ''سالک صاحب آپ سے بات کریں گے''۔ پی اے نے لائن تھروکی تو سالک

Scanned with CamScanner

صاحب فون پر تھے۔ میں نے تقریباً نعرہ لگاتے ہوئے کہا ''السلام علیکم سر، بہت بہت مبارک ہو''۔ دوسری جانب سے آواز آئی۔ ''وعلیکم السلام، شکریہ۔ میجر صولت رضا آپ نے ہیلمٹ خرید لیا ہے؟'' ایک لمحے کے لیے تو میں سناٹے میں آ گیا۔ جی سر، جی سر۔ ساڑھے سات بجے سے پہن کر بیٹھا ہوں سر۔ میرا جواب سن کر ادیب صدیق سالک ڈائریکٹر آئی ایس پی آر پر حاوی ہو گیا۔ فون پر ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا تو میرے اوسان بحال ہوئے۔ میں نے خوشامدانہ لہجے میں ایک اور فقرہ آگے بڑھایا۔ ''سر! آپ کی کمان میں آغاز سے ہی مخبری کا نظام بہت اعلیٰ دکھائی دیتا ہے'' سالک صاحب کب چوکنے والے تھے۔ فوراً بولے ''فی الحال اس شعبے میں پہلے سے تعینات سٹاف سے استفادہ کر رہا ہوں، لہٰذا آپ زیادہ محتاط رہیں''۔ بریگیڈیئر صدیق سالک نے فوج میں کمیشن سے شہادت تک مثالی محنت، جذبے اور جوان مردی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے۔ انہوں نے زندگی کا ہر لمحہ بھرپور انداز میں بسر کیا۔ صدیق سالک بنیادی طور پر ایک دیانتدار قلم کار تھے۔ سرکاری ملازمت کے مخصوص تقاضوں کے باوجود انہوں نے قاری سے کبھی بے وفائی نہ کی۔ وہ محنت پر یقین رکھتے تھے، فوج میں ترقی کی منازل طے کرتے رہے۔ کیپٹن، میجر، لیفٹیننٹ کرنل، فل کرنل اور بریگیڈیئر۔ اس کے بعد بھی مزید ترقی کی راہیں کھلی تھیں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا اور وہ 17 اگست 1988ء کو جام شہادت نوش کر گئے۔

صدیق سالک کی پوری سروس ایک ڈٹ جانے والے پروفیشنل کی ہی رہی۔ ان کی شہادت کے بعد آئی ایس پی آر ایک ''بے بس یتیم'' کی مانند تھا۔ سب کی نظریں صدیق سالک کی کرسی پر تھیں لیکن محض کرسی پر بیٹھنے سے کوئی صدیق سالک نہیں بن سکتا تھا۔ عبوری دور میں چند ایک نے کوشش کی لیکن منہ کے بل گرے۔ کچھ عرصہ بعد بریگیڈئر ریاض اللہ ڈائریکٹر آئی ایس پی آر تعینات کر دیئے گئے۔ ان کا بنیادی تعلق فوج کی ایک پیادہ رجمنٹ سے تھا اور عہدہ سنبھالنے کے لیے پوری سروس میں پہلی مرتبہ آئی ایس پی آر کے دفاتر تشریف فرما ہوئے۔ ان کی تعیناتی سے پیشہ وارانہ بے بسی کا دورانیہ طویل تر ہوتا گیا اور میڈیا کی نظروں میں آئی ایس پی آر باوردی مزاح (ہیومران یونیفارم) کا سب سے اہم منبع بن گیا۔ ان حالات میں صدیق سالک کی کمی بے حد محسوس کی گئی۔

آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر ریاض اللہ خان بعد میں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی پا گئے۔ ریاض اللہ خان راولپنڈی سازش کیس کے مرکزی کردار سابق میجر جنرل محمد اکبر خان سے بے حد متاثر تھے۔ ا

ن کیا خیال تھا کہ بری فوج نے جو نمایاں لڑاکا آفیسر پیدا کیے ہیں، ان میں سب سے نمایاں میجر جنرل اکبر خان اور جنرل ٹکا خان ہیں۔ ریاض اللہ

مجھے 102 درجے کا بخار ہے اور آرمی چیف نے مجھے
آدھا گھنٹہ کھڑا کیے رکھا ہے، بے نقط سنائی ہیں
ایسے الفاظ میں نے پوری سروس میں نہیں سنے

Scanned with CamScanner

صدر مملکت غلام اسحاق خان نے آرمی چیف سے پوچھا کہ ''تمہارا آئی ایس پی آر مجھے ''ڈاؤن'' کرنے پر لگا ہوا ہے، آخر کیوں؟''

خان مرحوم ان دونوں جنرل آفیسرز کے بارے میں ٹی وی اور سینما کے لیے فلم بنانے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔ میں میجر جنرل ریاض اللہ خان مرحوم کے دور میں آئی ایس پی آر کراچی میں تعینات تھا۔ یہ 1988ء سے 1991ء کا ذکر ہے۔ میجر جنرل ریاض اللہ خان جب کراچی تشریف لاتے تو صحافیوں، قلم کاروں اور جنرل صاحب کے درمیان دلچسپ اور معنی خیز گفتگو سے لطف اندوز ہونے کی سعادت نصیب ہوتی۔ ایک مرتبہ کسی تیکھے قلم کار نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا کہ ''کاش! لیاقت علی خان کے خلاف راولپنڈی سازش کیس میں ملوث تمام افراد کو فائرنگ سکواڈ کے حوالے کر دیا جاتا تو وطن عزیز سیاسی لحاظ سے صراط مستقیم پر گامزن رہتا''۔ پرکشش شخصیت اور دھیمے لب و لہجے کے مالک میجر جنرل ریاض اللہ خان سے یہ قیمتی مشورہ برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے پھر اپنے مخصوص ''عسکری انداز'' میں اس قلم کار کی خوب خبر لی۔ میجر جنرل ریاض اللہ خان بنیادی طور پر انفینٹری سے تعلق رکھتے تھے۔ صدیق سالک کی شہادت کے بعد جنرل اسلم بیگ نے آئی ایس پی آر کی کمان انہیں سونپ دی۔ انفینٹری کے ٹو سٹار جنرل اور کراچی کے تیکھے قلم کار کے درمیان بحث سے مجھے کراچی میں فوج کا تعلقات عامہ بھسم ہوتا دکھائی دیا۔ بہر حال بڑی مشکل سے فائر بندی ہوئی۔ اس روز مجھے اپنے ڈائریکٹر جنرل کی راولپنڈی سازش کیس کے مرکزی کردار کے ساتھ دلی عقیدت کا احساس ہوا۔ بہر حال میجر جنرل ریاض اللہ خان کی رحلت تک مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم کے درپے عسکری شخصیت میجر جنرل اکبر خان کو جنرل ٹکا خان کے ساتھ ایک فلم میں کیسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ خیر جگر کے جان لیوا سرطان نے میجر جنرل ریاض اللہ مرحوم کو مہلت نہ دی اور ان کی المناک وفات کے ساتھ ہی مجوزہ فلم داخل دفتر کر دی گئی۔ میجر جنرل ریاض اللہ خان مرحوم کی رحلت کے بعد چند روز اسی شش و پنج میں گزرے کہ اب ان کی جانشینی کا شرف کون حاصل کرتا ہے۔ ایک رائے یہ تھی کہ آئی ایس پی آر کے بریگیڈیئر ایس ایم اے اقبال کو سربراہ تعینات کر دیا جائے گا لیکن آخر کار قرعہ فال میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کے نام نکلا جو بنیادی طور پر کور آف انجینئرز سے تعلق رکھتے تھے۔

پرکشش شخصیت کے حامل میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کو انگریزی لکھنے اور بولنے میں مہارت حاصل تھی۔ شستہ اردو میں مافی الضمیر بیان کرتے، البتہ اردو لکھنے اور پڑھنے کی جانب طبیعت مائل نہ تھی۔ جنرل آصف نواز نے آرمی چیف کا عہدہ سنبھالتے ہی اپنے پیش رو جنرل مرزا اسلم بیگ کی میڈیا پالیسی میں خاصی ترامیم کیں۔ انہوں نے سیاسی حکومت کے متوازی ابلاغی نظام کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے پبلسٹی میں ٹھہراؤ کی ہدایات جاری کیں۔ یوں آئی ایس پی آر میں بھی قدرے سکون آ گیا۔ میجر جنرل

Scanned with CamScanner

جہانگیر نصراللہ کو ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر تعینات ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ ایک روز دفتر پہنچتے ہی مجھے طلب فرمایا۔ عموماً گفتگو اور ہدایات کے لیے لہجہ میں نرمی ہوتی تھی لیکن اس صبح ناگواری نمایاں تھی۔ فرمانے لگے کہ یہ تمہارے اخبارات والے دوست رات کو آرام کیوں نہیں کرنے دیتے، رات کو کیوں فون کرتے ہیں۔ گزشتہ رات کوئی صاحب مجھے نیند سے بیدار کرنے کے بعد گپ شپ پر اصرار کر رہے تھے۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کیا کام کرتے ہیں تو فرمانے لگے کہ اگلے ہفتے پڑھ لینا کہ میں کیا کام کرتا ہوں سب معلوم ہو جائے گا۔ ان صاحب کا نام جنرل صاحب کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ چند روز بعد کراچی کے ہفت روزہ تکبیر میں سعود ساحر کی ڈائری شائع ہوئی جس میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ''آئی ایس پی آر کے نئے سربراہ صحافیوں سے پوچھتے ہیں کہ آپ کیا کام کرتے ہیں''۔

8 جنوری 1993ء کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ میں نے ڈی جی آئی ایس پی آر کو اطلاع دینے کی کوشش کی۔ تب موبائل فونز کا زمانہ نہیں تھا۔ ڈی جی آئی ایس پی آر اسلام آباد سے بمشکل دستیاب ہوئے جہاں وہ کسی تقریب میں شریک تھے۔ اطلاع سنتے ہی سکتے میں آ گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ دفتر تھے۔ ان کے پاس آرمی چیف کے انتقال کی مصدقہ خبر تھی۔ اب پریس ریلیز کی تیاری اور دیگر امور کو ترتیب دینے کا مرحلہ تھا۔ آرمی ہاؤس کے دروازے کھول دیئے گئے۔ رات بھر تعزیت کرنے والے آتے رہے۔ رات گئے قائم مقام آرمی چیف لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف چودھری نے چارج سنبھال لیا۔ چند روز بعد صدر پاکستان غلام اسحاق خان نے لیفٹیننٹ جنرل عبدالوحید کاکڑ کو جنرل کے رینک پر ترقی دے کر چیف آف آرمی سٹاف تعینات کر دیا۔ جنرل عبدالوحید کاکڑ نے کمان سنبھالتے ہی سندھ میں جاری اندرونی سلامتی کے آپریشن پر مرحلہ وار نظر ثانی شروع کر دی جس سے آپریشن کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل جہانگیر نصراللہ نے بری فوج وقار برقرار رکھنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے صحافیوں اور ایڈیٹروں سے رابطوں کے ذریعے عسکری موقف پیش کیا۔

آمدم برسر مطلب۔ میں بات کر رہا تھا کہ بریگیڈیئر صدیق سالک کی شہادت کے بعد بریگیڈیئر ریاض اللہ کو آئی ایس پی آر کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ ہوسکتا ہے کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی نافذ کردہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے کسی سینئر جرنلسٹ کو اس عہدے پر تعینات کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ نامور صحافی اور ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر جناب زیڈ اے سلہری کو فیلڈ مارشل ایوب خان نے کرنل کا عہدہ دے کر آئی

جنرل کے ایم عارف بھی معمول کی عسکری تقریبات میں طویل گفتگو فرماتے تھے، ان کی تقاریر کو اخبارات میں شائع کرانا بھی کسی چیلنج سے کم نہیں ہوتا تھا

Scanned with CamScanner

بریگیڈیئر صدیق سالک کی شہادت کے بعد ہم عادی ہوگئے تھے کہ دو تین برس کے بعد ایک نئے ''ٹو سٹار'' کو آئی ایس پی آر سے روشناس کرانا ہے

ایس پی آر کا سربراہ مقرر کر دیا تھا۔ ہمارے سینئرز کے بقول سلہری صاحب زیادہ عرصہ اس عہدہ پر قائم نہیں رہے کیونکہ اس زمانے کی ''ہائی کمان'' کو لمبے بال رکھے اور وکٹورین انگریزی لکھنے اور بولنے والا ''کرنل'' ایک جنرل یا فیلڈ مارشل سے براہ راست ہدایات لینا پسند نہیں تھا۔ شاید کرنل سلہری بھی ذہنی لحاظ سے ''یس سر'' کے پابند نہیں تھے۔

بریگیڈیئر ریاض اللہ نے عہدہ سنبھالتے ہی جنرل مرزا اسلم بیگ کی ہدایات کے مطابق میڈیا سے قریبی تعلقات استوار کرنے کا چیلنج قبول کر لیا۔ کراچی میں اولین دورے پر تشریف لائے تو میں ایئرپورٹ پر استقبال کے لیے موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مخصوص لہجے میں کہنے لگے ''صولت صاحب! میں عارضی ہوں، سالک کے بعد اب تمہارا نمبر ہے''۔ بریگیڈیئر ریاض اللہ کا یہ فصیح و بلیغ جملہ آج بھی کان میں گونجتا ہے تو دنیا کی بے ثباتی پر یقین اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ دراصل موصوف یہ کہنا چاہتے تھے کہ بریگیڈئر سالک کے بعد اب آئی ایس پی آر آپ ''لوگوں'' کے سپرد ہے۔ میں محض عارضی طور پر سربراہ ہوں۔ پہلی ''شنوائی'' کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی خاکی وی آئی پی کے ساتھ سی ون تھرٹی (C-130) میں بیٹھا کلمہ شہادت کا ورد کر رہا ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ بریگیڈیئر ریاض اللہ بھی ہم جیسے ہوگئے۔ صحافیوں سے براہ راست ملاقات کے حوالے سے بہت حساس تھے۔ کراچی جب بھی تشریف لاتے تو کمانڈر روشن (پی آر او پاک نیوی) کے ساتھ مل کر مجھے ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کو ''مصروف'' رکھنے کے لئے دن رات ایک کرنا ہوتا تھا۔ اخبارات کے دفاتر میں میل ملاقات، سیمینار اور دفتر میں بالمشافہ ملاقاتیں ترتیب دینا ''مشق سخن'' سے زیادہ مشقت تھی۔ ہم ایسے ڈائریکٹر صاحبان اس کے عادی تھے جو ہمیں اپنے دوستوں کے روبرو پیش کرتے تھے۔ اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ آئی ایس پی آر کے سربراہ کو میڈیا میں لئے لئے پھر رہے ہیں۔ تعارف کے لیے ان کے ایک قابل فخر فوجی ہونے کی حیثیت سے زمانہ امن و جنگ میں کارہائے نمایاں مزید نمایاں کر کے بیان کرتے تھے۔ اب قلم کار یا صحافی کبھی ہمارا منہ تکتے تھے اور اکثر ''باس'' کا جو کسی لمحے بھی دور رس نتائج کے حامل سوال یا جواب کا منبع بن سکتے تھے۔ بریگیڈیئر ریاض اللہ صاف گو، دیانتدار اور لگی لپٹی رکھے بغیر دوٹوک گفتگو کے عادی تھے، ظاہر ہے کہ ایک باوقار اور باصلاحیت سینئر فوجی افسر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کراچی کے اخبارات میں بذات خود جانے پر اصرار کرتے تھے۔ میں سٹاف کار میں جاتے ہوئے انہیں یاد کرایا کرتا تھا کہ جس اخبار میں جائیں اس کی تعریف ضرور کریں۔ میری درخواست پر بہت مشکل سے راضی ہوئے۔ کہنے لگے: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں کسی اخبار کا مطالعہ ہی نہ کروں اور اس کی تعریفیں شروع کر دوں''۔ ایک مرتبہ سخت لہجے میں

Scanned with CamScanner

مجھے خاموش کروانے کی کوشش کی۔ میں نے دوبارہ کہا: ''سر! یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ ہم ہر صحافی، ادیب اور میڈیا سے منسلک شخص اور ادارے کی تعریف کرتے رہیں خواہ ''دل'' راضی نہ بھی ہو''۔ یہ سن کر وہ خاموش ہوگئے۔ چند لمحے توقف کے بعد کہا: ''یہ بات مجھے پہلے معلوم ہوتی تو کبھی تمہارے ڈائریکٹوریٹ میں نہ آتا۔ مجھے چیف (جنرل اسلم بیگ) نے یہ نہیں بتایا جو تم کہہ رہے ہو''۔ اس کے بعد انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے میڈیا کے ''کاروباری'' کردار پر تفصیلی لیکچر دیا۔ بریگیڈیئر ریاض اللہ کی ''جارحانہ'' تعلقات عامہ مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندرون سندھ کے پریس کلبز میں پہلی مرتبہ فوج کا موقف توجہ کے ساتھ سنا گیا اور یہ تاثر کہ فوج صرف پنجابی اور اردو بولنے والوں کے پریس کو فوقیت دیتی ہے، بہت حد تک ختم ہوگیا۔ سندھی اخبارات سے براہ راست تعلق استوار ہوا۔ ان کے نوک دار رویے میں کمی آگئی۔ میں نے اپنے دفتر میں مددگار کے طور پر ایک سندھی بولنے والے سپاہی کو اٹیچ کیا ہوا تھا جو مجھے سندھی اخبارات سے اہم خبریں پڑھ کر سناتا تھا۔ یوں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کو سندھی پریس سے آشنائی میں مدد ملی۔ کبھی کبھار کسی اجتماع میں جنرل آصف نواز سندھی اخبارات کے مالکان سے ان کے اخبارات میں شائع ہونے والے مواد کے بارے میں گفتگو کرتے تو حیرانی قابل دید ہوتی۔ بعد میں سب کو معلوم ہوگیا کہ آئی ایس پی آر کراچی انگریزی اردو کے ساتھ سندھی اخبارات و جرائد سے بھی متاثر ہو چکا ہے۔ میں آج بھی سمجھتا ہوں کہ قومی سطح پر تمام پاکستانی زبانوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ کاش فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے زمانے میں قائم کردہ نیشنل پریس ٹرسٹ کو یہ مشن سونپا جاتا کہ سندھی، بلوچی، براہوی، پنجابی، سرائیکی، ہندکو، پشتو اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے جرائد اور کتابوں وغیرہ کو ٹھوس مالی امداد کے ذریعے توانا رکھا جائے۔ این، پی ٹی نے منافع بخش اخبارات کو تحویل میں لے کر نظری لحاظ سے ''بددیانتی'' پر مبنی اقدامات کیے جس کے باعث روز اول ہی سے ایک اہم قومی ادارہ مشکوک ہوگیا اور آخر کار اپنے ساتھ مقبول ترین اخبارات کو بھی لے ڈوبا۔

''ضرب مومن'' مشق کے لئے کراچی سے نامور ایڈیٹر، سینئر صحافی اور تعلقات عامہ کے شعبے سے منسلک شخصیات شریک ہوئیں۔ ''میدان جنگ'' پہنچنے سے قبل ہی ناگہانی صورتحال کا سامنا ہوا۔ ہم کراچی سے فیصل آباد جانے کے لیے پی آئی اے کے مسافر بردار طیارے میں سوار ہوئے۔ ابھی بمشکل پندرہ بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ پائلٹ نے اعلان کیا کہ بعض آپریشنل وجوہات کے باعث ہم واپس کراچی جارہے ہیں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی جہاز کے عملے میں بھگدڑ مچ گئی۔ بوڑھے مسافروں کو آگے آنے کی ہدایت کی گئی، اب ایک اور اعلان ہوا

چینی افواج کے لیے ابلاغ کا موثر ترین نظام ہے، ان کے ہاں عوام سے زیادہ افواج میں خدمات انجام دینے والے افسروں اور دیگر باوردی اہلکاروں کی ابلاغی کیفیت پر توجہ مرکوز ہے

Scanned with CamScanner

سرائیوو میں دریا کنارے اترے تو کچھ عمر رسیدہ افراد بیٹھے تھے، ہم جونہی قریب ہوئے تو انہوں نے ہمارے ہاتھ چومنا شروع کر دیئے پاکستان آرمی، پاکستان آرمی پکارتے ہوئے وکٹری کا نشان بلند کرتے

کہ ہم بہت جلد نیچے اترنے والے ہیں۔ آپ سب پاؤں سے جوتے اتار دیں۔ نکٹائی کھول دیں، کالر اونچے کر لیں، منہ سے مصنوعی دانت نکال لیں۔ ایمرجنسی لینڈنگ ہوگی۔ ہاتھ ٹانگوں کے نیچے لے جائیں۔ سر گھٹنوں پر رکھ دیں (مرغا پوزیشن)، بچوں کو باندھ لیں وغیرہ وغیرہ۔ اور ساتھ ہی جہاز ڈگمگایا۔ مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ ایک ایئر ہوسٹس نے ایمرجنسی گیٹ کے پاس قاضی اسد عابد (عبرت) اور سجاد میر (حریت) کو بٹھایا اور یہ ہدایت کی کہ جہاز رکتے ہی ایمرجنسی گیٹ کھول دیں۔ مجھے یاد ہے کہ پورے جہاز میں آہ و بکا تھی اور تیزی سے لینڈنگ کی طرف گامزن تھا۔ جہاز کے پہیے زمین پر لگے تو سکون ہوا۔ اب رخ ویران رن وے کی جانب تھا۔ جہاز رکا تو شوٹ کھل گئیں اور مسافر پھسل کر نیچے اترنے لگے۔ ایک اور ایمرجنسی گیٹ کھلا تو ہم نے ونگ پر چھلانگ لگا دی، مجھ سے پہلے بیرسٹر ثمن خان (کالم نگار) بھی اسی راستے سے نکل کر جہاز کے ونگ پر کھڑے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی نے کال کر کے اطلاع دی تھی کہ جہاز میں ''بم'' ہے، لہٰذا یہ ساری کارروائی کی گئی ہے، یوں ہماری ''عسکری'' مشق کا آغاز دوران پرواز ہی ہو گیا۔ تین چار گھنٹے کراچی ایئرپورٹ پر ہی قیام کیا گیا۔ جہاز کلیئر ہوا تو دوبارہ روانگی کا حکم ملا۔ ہمارے گروپ میں شامل میرے سابق ڈائریکٹر بریگیڈیئر (ر) تفضل حسین صدیقی اور سینئر کالم نگار ایم۔ ایچ۔ عسکری نے دوبارہ سفر سے معذرت کر لی۔ رات گئے فیصل آباد ایئرپورٹ پر اترے، وہاں سے آرمی کوچز میں ''میدان جنگ'' کی جانب روانہ ہو گئے۔ علاقے میں ابتدائی بریفنگ کے بعد ایک سپیشل ٹرین میں سوار کرایا گیا تاکہ دونوں متحارب افواج بلیو لینڈ اور فاکس لینڈ کے مابین جنگ کے حوالے سے نقل و حرکت اور مختلف زاویے سے عسکری اقدامات کا بچشم خود معائنہ کر سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل قلم کے لئے یہ ایک منفرد تجربہ تھا۔ مشق کے دوران صحافیوں کو مختلف نوعیت کے ہتھیاروں اور عسکری آلات سے بھی روشناس کروایا گیا۔ ضرب مومن کی کہانی بہت طویل ہے تاہم ایک واقعہ کا ذکر کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ کراچی سے ہمارے دوست رپورٹر قیصر محمود صاحب بھی رپورٹنگ ٹیم کا حصہ تھے۔ انہیں ایک انفینٹری یونٹ کے ساتھ منسلک کیا گیا تھا تاکہ اگلے مورچوں سے آنکھوں دیکھا حال رپورٹ کر سکیں۔ ان کا بیان ہے کہ رات گئے کسی مقام پر مورچہ زن تھے۔ انہیں ایک انفرادی خیمہ ملا ہوا تھا کہ تھکن کے باعث آنکھ لگ گئی۔ یونٹ کو جنگی احکامات کے تحت سورج نکلنے سے قبل کہیں اور منتقل ہونے کے احکامات مل گئے۔ یونٹ کے اہلکاروں نے قیصر محمود صاحب کو جگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ وہ اپنے چھوٹے خیمے جس میں ایک شخص ہی سما سکتا ہے، سوئے رہ گئے۔ جب زیادہ دھوپ نکلی تو آنکھ کھلی تو ہر طرف ویرانہ تھا۔ بہرحال انہیں میری ہدایت یاد تھی

کہ ''ایمرجنسی یا گم ہوجانے کی صورت میں زمین پر بچھائی گئی ٹیلی فون تار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیں۔ کوئی نہ کوئی ''برسرپیکار'' آرمی یونٹ مل جائے گی۔ قیصر محمود صاحب بھی گرتے پڑتے سہ پہر کے بعد ایک آرمی یونٹ جا پہنچے جہاں انہیں متحارب فوج کا ایک اہلکار سمجھ کر تحویل میں لے لیا گیا۔ بہرحال افسر کے روبرو پیش کیا گیا تو راز کھلا کہ یہ فرائض منصبی میں بری طرح ملوث صحافی ہے۔ جب ہمیں اطلاع ملی تو بریگیڈیئر ریاض اللہ کی اجازت سے قیصر محمود کی پوسٹنگ اسی یونٹ میں کردی گئی جس نے انہیں تحویل میں لیا تھا۔ ضرب مومن مشق کو منعقد ہوئے کئی برس بیت گئے ہیں، قیصر محمود صاحب کا یہ واقعہ اس لیے ذہن میں دوبارہ نمایاں ہوگیا کہ چند ہفتے قبل ہی قیصر محمود صاحب کینسر کے موذی مرض کے باعث انتقال کر گئے ہیں۔ مرحوم زندہ دل، بااصول اور ملنسار شخصیت تھے۔ اللہ کریم مغفرت فرمائیں۔ آمین

جنرل اسلم بیگ کی ریٹائرمنٹ قریب آرہی تھی۔ نئے آرمی چیف کے لیے اسمائے گرامی کے مابین دوڑ شروع ہوگئی۔ فیصلہ وزیراعظم محمد نواز شریف کی تجویز پر صدر مملکت غلام اسحاق خان نے کرنا تھا۔ صاحب الرائے شخصیات کے خیال میں لیفٹیننٹ جنرل حمید گل ہی مناسب چوائس تھے۔ تاہم لڑاکا عسکری شعبے سے تعلق رکھنے والے تمام تھری سٹارز ''امیدوار'' تصور کیے جاتے ہیں۔ یعنی انفینٹری، آرٹلری اور آرمرڈ کور وغیرہ براہ راست لڑاکا شعبے تصور ہوتے ہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ میاں محمد نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کو بیرون ملک سفر کے دوران منصب سے ہٹانے کے بعد لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کا انتخاب کیا تھا جو کہ انجینئرز کور (یعنی غیر لڑاکا گروپ) سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ فیصلہ بھی روایات سے ہٹ کر تھا اور اسی سے ایک نئی بحث نے جنم لیا)۔

جنرل مرزا اسلم بیگ کی ایکسٹینشن کی افواہ بھی پھیلی لیکن یہ بات واضح کی گئی کہ آرمی چیف اس کے حق میں نہیں ہیں، دوسری جانب سیاسی حلقے وثوق سے یہ بات کہہ رہے تھے کہ وزیراعظم نیا آرمی چیف تعینات کرنا چاہتے ہیں۔ آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر ریاض اللہ کا خیال تھا کہ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کے آرمی چیف تعینات ہونے کے امکانات زیادہ ہیں کیونکہ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل مخصوص پس منظر رکھتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ سیاسی قیادت ایک خالص پیشہ وارانہ پس منظر رکھنے والے جنرل آفیسر کو ترجیح دے۔ ایک روز چند سینئر افسروں کی موجودگی میں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز نے یہ سوال مجھ سے دریافت کیا کہ میں نے بریگیڈیئر ریاض اللہ کی بات کو آگے بڑھایا تو ماحول خوشگوار ہوگیا۔ مجھے یاد ہے کہ فضاء میں تناؤ موجود تھا۔ شاید اسی وجہ سے نئے آرمی چیف کا اعلان جنرل اسلم بیگ کی ریٹائرمنٹ سے کافی پہلے کر دیا گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل آصف نواز کے دفتر اور گھر میں

پاک فوج کی بدولت بوسنیا کے مسلمانوں کو امید اور کامیابی کی ایک نوید ملی عزت بیگووچ سے ملاقات بھی ہوئی، انہوں نے پاکستان کی امداد اور پاک فوج کی خدمات کا اعتراف انتہائی جذباتی انداز میں کیا

Scanned with CamScanner

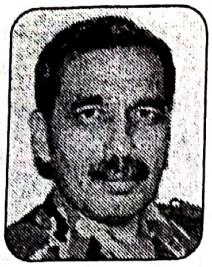

سرائیوو شہر عظیم تاریخی ورثے کا حامل ہے، رہن سہن اور ظاہری شناخت کے لحاظ سے یورپ کا شہر ہی دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے رگ و پے میں مسلم قومیت اور ترک ثقافت رواں دواں ہے

مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ کراچی کور میں الگ مسرت و انبساط کی کیفیت تھی۔ جنرل آصف نواز کو آرمی چیف کا منصب سنبھالنے سے قبل کچھ مدت کے لئے چیف آف جنرل سٹاف کے آفس میں فرائض انجام دینے تھے۔ انہوں نے جنرل ہیڈ کوارٹرز پہنچتے ہی جن افسران اور عملے کو رپورٹ کرنے کی ہدایت کی ان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ کراچی میں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل عارف بنگش مقرر ہوئے تھے، انہوں نے میری راولپنڈی روانگی کا ''حکم نامہ'' پڑھتے ہی کہا کہ فوراً روانہ ہو جاؤ۔ ایک مرتبہ پھر آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ کے در و دیوار منتظر تھے۔ اس برس میرا نام میجر سے لیفٹیننٹ کرنل کے لئے پروموشن بورڈ میں بھی شامل تھا۔ یہ آرمی کیریئر میں کسی افسر کے لئے بہت اہم اور قیمتی لمحات ہوتے ہیں۔ معمولی کوتاہی یا لغزش برسہا برس کی دن رات محنت پر پانی پھیر سکتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ کراچی میں معاملات کافی حد تک ازبر ہو گئے ہیں، آرمی چیف اور وہ بھی جنرل آصف نواز کے ساتھ ''پریس رابطہ افسر'' کی نوکری دودھاری تلوار کے مترادف ہے۔ میری حیدرآباد ''ڈومی سائیلڈ'' بیگم اور کراچی میں پلے بڑھے ''اردو سپیکنگ'' بچے اور کچھ نہیں تو راولپنڈی کی سردی کو تو تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ بہرحال پہلے میں اکیلا ہی ''رپورٹنگ فار ڈیوٹی'' گنگناتا نئے آرمی چیف کے آفس جا پہنچا۔ ٹیم ترتیب دی جا رہی تھی۔ مجھے جنرل آصف نواز نے کرنل عزیز احمد خان کے ساتھ فرائض انجام دینے کی ہدایت کی۔ کرنل عزیز آرمی ایجوکیشن کور میں انگلش لینگویج کے انسٹرکٹر تھے اور طویل عرصہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں گراں قدر خدمات انجام دے چکے تھے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ سرکاری رہائش گاہ سے اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ لہٰذا جنرل آصف نواز منصب سنبھالتے ہی آرمی چیف کی سرکاری قیام گاہ میں رہائش پذیر ہو گئے جہاں ایک مختصر سی تقریب ہوئی۔ دستے نے سلامی دی اور جنرل آصف نواز نے مختصر خطاب کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس عمارت میں انہوں نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں ایک کیپٹن کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے تھے۔ جنرل آصف نواز کا تعلق بھی پنجاب رجمنٹ کی شیر دل بٹالین سے تھا۔ پہلے دن فرمان امروز جاری کیا گیا جس میں نئے آرمی چیف نے واضح کہا: ''ایک سپاہی کی شان صرف اس کے اپنے پیشے میں مہارت حاصل کرنے میں ہے۔ ہمیں صرف سپاہی بن کر رہنا ہے، اس میں کسی اور کردار کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ پاکستان صرف ایک ملک ہی نہیں ایک نظریہ ہے اس لیے اس کی حفاظت ایک قومی اور پیشہ وارانہ فریضے سے بڑھ کر ایک مذہبی فریضہ ہے۔ یہ ہم سب کا ایمان ہے''۔ جنرل آصف نواز نے مزید ہدایت کی کہ اپنی زندگیوں کو قرآن اور رسول کریم ﷺ کی سنت کے مطابق گزاریئے۔ اسلام کو اپنی زندگی

Scanned with CamScanner

بنا لیجیے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا قول یاد رکھیں:
''خبردار ایک لمحے کے لیے بھی کسی انسان کی خوشنودی کے لئے اللہ تعالیٰ کی ناراضی مول نہ لو''۔

یہ فرمان امروز آرمی یونٹس اور دیگر اداروں میں خصوصی اجتماعات کے دوران پڑھ کر سنایا گیا۔

جنرل آصف نواز علی الصبح بیدار ہونے کے عادی تھے اور آٹھ بجے صبح اپنے آفس میں موجود ہوتے تھے۔ یوں ایک لحاظ سے سٹاف اور دیگر عملے کو تیاری کے لیے ایک گھنٹہ قبل ہی چوکس رہنا ضروری تھا۔ یہ طریقہ کار کراچی میں کور کمانڈر کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ میں ساڑھے آٹھ بجے صبح تک پریس بریف اور اخبارات سے اہم خبروں کے تراشے ''بقلم خود'' تیار کر کے پہنچا دیتا تھا۔ بعض ''شب بیدار'' افسر نیم خوابیدہ حالت میں آنکھ ملتے ہی بھاگم بھاگ دفتر پہنچا کرتے تھے۔ دوسری جانب دوپہر دو بجے گھر واپسی کے لیے سٹاف کار تیار ہو جاتی تھی۔

ان کا خیال تھا کہ دفتر میں مقررہ وقت سے زیادہ ٹھہرنا نظام میں پیچیدگی لاتا ہے۔ افسر کو چاہیے کہ فیملی اور سپورٹس کے لیے بھی وقت نکالے۔ زیادہ ضروری کام ہے تو گھر سے دوبارہ آفس آ جائے۔ آرمی چیف کے اے ڈی سی نے مجھے کہا کہ آپ مشورہ دیں کہ جی ایچ کیو آٹھ بجے کے بعد آیا کریں کیونکہ آرمی چیف کے آفس اور دیگر ملحقہ دفاتر کی صفائی ساڑھے سات بجے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ برسوں سے مقررہ وقت ہے اب متعلقہ عملہ چھ بجے آنے سے رہا۔ خاص طور سے سردیوں میں۔ لیکن آفس میں جنرل آصف نواز کی آمد اور روانگی کے اوقات تبدیل نہ ہوئے البتہ اس کے باعث بیسیوں کو صبح خیزی کی عادت ہو گئی۔ آرمی چیف اخبارات کے سرسری مطالعہ کے بعد روزمرہ سرکاری فرائض ادا کرتے تھے۔ دن بھر بھرپور انداز میں مصروفیت ان کی عادت ثانیہ تھی۔ کچھ عرصہ بعد یونٹس کے دورے اور عسکری مشقوں کا معائنہ بھی شروع ہو گیا۔ جنرل آصف نواز کے دور میں کئی اہم واقعات پیش آئے جن میں کراچی آپریشن سرفہرست ہے۔ ایک روز ''کیفیت'' جسے مصروفیت کہنا درست نہیں ہو گا۔ اس کیفیت نے آرمی چیف کی توجہ کو بھی متاثر کیا تھا۔ یہ میاں محمد نواز شریف کا عمومی رویہ تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آرمی چیف سے جس ''قرب'' کے آرزو مند ہیں وہ انہیں حاصل نہیں ہو رہا۔ تاثر یہ ہے کہ آرمی چیف صدر پاکستان غلام اسحاق خان کے زیادہ قریب ہیں۔ اس تاثر کی اطلاع جنرل آصف نواز کو بھی تھی لہٰذا انہوں نے یہ تاثر زائل کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ وزیراعظم کو اپنے ہمراہ آرمی مشقوں، عسکری تقریبات اور دیگر بریفنگز وغیرہ پر لے کر جاتے تھے۔ کئی مرتبہ بریفنگ وغیرہ میں بار بار یہ بات دہراتے تھے کہ فوج کی ملکی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں ہم اس کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود نواز شریف اور ان کے چند قریبی ساتھی کسی نہ

جب تک بوسنیا کی حدود میں رہے بازار، کیفے، مساجد، دفاتر اور پارکس وغیرہ میں جہاں کہیں عوام ہمیں دیکھتے تو ''پاکستان، پاکستان'' کی صدائیں بلند کرتے تھے

Scanned with CamScanner

میں نے محسوس کیا کہ سرب فوج، میڈیا اور سیاسی رہنماؤں کا کرب سقوط مشرقی پاکستان کے سانحہ سے ملتا جلتا ہے لہٰذا میں نے اسی بنیاد پر ان سے راہ ورسم بڑھائی

کسی حوالے سے مکمل تعاون کی ''عدم دستیابی'' کا تاثر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ شاید انہیں ہر دس پندرہ دن کے بعد آرمی چیف سے یہ الفاظ سننا پسند تھے کہ فوج کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تاثر برقرار بھی ان کے وسیع تر سیاسی عزائم کا حصہ ہو۔ بہر حال کچھ واقعات بھی ہوئے جو منظر عام پر بھی آئے۔ چند ایک شاید زبانی گفتگو اور سرکاری فائلز ہی میں دب گئے۔

جنرل آصف نواز کا ایک اہم فیصلہ چند بااثر سیاسی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے فوجی افسروں (کیپٹن / میجر) کو سول سروس کے امتحانات میں شرکت کی اجازت دینا تھا۔ ان میں سے شاید کچھ کا سول ملازمت میں براہ راست تقرر بھی تھا۔ جنرل آصف نواز نے واضح کیا کہ بااثر اور متمول سیاسی خاندانوں کے چشم و چراغ فوج میں رہیں گے تو اس سے جوانوں کے مورال اور استعداد کار پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ نواز شریف نے اپنے حامی قومی اسمبلی کے بعض اراکین کو یقین دلایا تھا کہ ان کے بیٹے، بھتیجے اور بھانجے وغیرہ جو فوج میں خدمات انجام دے رہے ہیں سول سروس جیسے پولیس، ڈی ایم جی، کسٹم، انکم ٹیکس وغیرہ میں ٹرانسفر کر دیئے جائیں گے لیکن جنرل آصف نواز نے دوٹوک الفاظ میں ''اعتراض'' اٹھا دیا اور یہ ''حکم عدولی'' حد درجہ منفی تاثر کے ساتھ محسوس کی گئی۔ شاید اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک روز آٹھ بجے کے قریب آئی ایس پی آر پہنچا ہی تھا کہ دو تین نائب قاصد ایک ہی بات بار بار دہرا رہے تھے کہ چیف آفس سے فون پر فون آرہے ہیں۔ آپ کو فوراً بلایا ہے۔ میں نے ابھی تمام اخبارات نہیں دیکھے تھے پھر بھی ''دوڑے چل'' انداز میں اے ڈی سی کے پاس پہنچا تو انہوں نے سانس بحال کرنے کے لیے پانی پینے کی مہلت نہیں دی۔ آرمی چیف آفس کا درواز کھلا اور میں جنرل آصف نواز کے سامنے تھا۔ انہوں نے مخصوص انداز میں پوچھا: ''تم رات کہاں تھے؟''۔ میرے لیے یہ مانوس جملہ تھا۔ اس سے مراد یہ تھا کہ اخبار میں کچھ ناپسندیدہ متن خبر، اداریہ یا کالم کی صورت میں شائع ہوگیا تھا۔ اور اب اس کی جواب طلبی ہوئی ہے۔ ہر پی آر او کا رٹا رٹایا جواب ہوتا ہے: ''سر! میں رات کو پریس کلب میں یا فلاں اخبار کے دفتر میں تھا''۔ جنرل آصف نواز کے ساتھ نوکری میں رٹا رٹایا جواب نہیں چلتا تھا۔ سچ کہنے میں کافی عافیت تھی اور یہ میرا تجربہ بھی تھا۔ لہٰذا میں نے بتایا کہ! رات گھر پر ہی تھا۔ اب جنرل صاحب کی مزید آواز اونچی ہوگئی۔ ''تم گھر میں رہو اور اخباروں میں فضول باتیں شائع ہوتی رہیں''۔ (بزبان انگریزی)۔ جنرل آصف نواز سرکاری غصے کا اظہار بیک وقت انگریزی، اردو اور پنجابی زبان میں کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر میں دو قدم آگے بڑھا اور کنکھیوں سے میز پر رکھے اخبار کو دیکھا۔ لے آؤٹ سے ''نوائے وقت'' کا ادارتی

صفحہ دکھائی دیا۔ میں نے ایک اور رسک لیا اور چیف کے سامنے رکھا ہوا اخبار اٹھالیا۔ جنرل آصف نواز کو اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ وہ ابھی خاموش ہی تھے کہ میں نے ''تم رات کدھر تھے'' کے انداز میں دریافت کیا ''سر! یہ اخبار کس نے رکھا ہے؟'' کیا مطلب ہے تمہارا؟ انہوں نے جوابی سوال کیا۔ میں نے کہا: ''سر! مطلب یہ ہے کہ صبح آٹھ بجے چیف آف آرمی سٹاف کے سامنے نوائے وقت کا ایڈیٹوریل صفحہ کس نے رکھا ہے؟ سر! آپ آرمی چیف ہیں، ساری فوج آپ کے احکامات کی منتظر ہے، اخبارات کا مطالعہ ہمارا کام ہے۔ آپ صرف ایک انگریزی اور ایک اردو اخبار صبح دیکھا کریں۔ اس کے بعد آئی ایس پی آر کا پریس بریف۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اردو اخبار کی ہیڈ لائینز اور انگریزی اخبار کا سپورٹس پیج''۔

اللہ کا شکر ہے کہ میرا ''ناگہانی'' عمل کارگر ثابت ہوا۔ جنرل آصف نواز کہنے لگے، ''ان کو سمجھا دو جو صبح صبح پیلے نیلے نشان لگا کر اخبار میز پر رکھ دیتے ہیں''۔ میں سمجھ گیا۔ آفس سے باہر نکل کر سیدھا بریگیڈیئر سکندر شامی کے پاس گیا جو سینئر سٹاف افسر تھے۔ ان سے درخواست کی کہ آرمی چیف کو صبح صبح صرف ہیڈ لائنز اور سپورٹس پیج تک ہی رہنے دیں۔ یہ اخبارات کے ادارتی صفحے پڑھنا آئی ایس پی آر کے افسروں کا کام ہے۔ انہوں نے خاموشی سے میری گزارش سنی۔ اور شاید سنی ان سنی کر دی۔

بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) سکندر شامی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں تیس گھنٹے کام کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انتہائی جفاکش، محنتی، فرض شناس اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ایک مثالی افسر تھے۔ جنرل آصف نواز بے پناہ خصوصیات کی وجہ سے ان پر اعتماد کرتے تھے۔ بریگیڈیئر سکندر شامی 65ء کی جنگ میں کھیم کرن کے محاذ پر شہید ہونے والے بہادر بریگیڈیئر شامی کے صاحبزادے ہیں۔ 1971ء کی جنگ میں ایک بہادر باپ کا یہ بہادر بیٹا شدید زخمی ہوا اور ان کا ایک پاؤں اڑ گیا۔ کافی عرصہ تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ اللہ کریم نے صحت یاب فرمایا اور روزمرہ ڈیوٹی انجام دینا شروع کر دی۔ مصنوعی پاؤں لگایا گیا۔ سخت محنت اور مثالی لگن کے ساتھ فرائض انجام دیتے تھے۔ پی ایم اے میں میجر کی حیثیت سے پلاٹون کمانڈر رہے۔ ترقی پا کر لیفٹیننٹ کرنل کے رینک پر پہنچے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنی یونٹ کے ساتھ لانگ مارچ میں سب سے آگے چلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس قدر خصوصیات کے حامل افسر کو یہ کہنا کہ ''مجھے میرا کام خود کرنے دیں'' آسان بات نہیں تھی۔

بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) ریاض اللہ خان کی وفات کے بعد جنرل آصف نواز نے میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ کو آئی ایس پی آر کا سربراہ مقرر کیا۔ یہ کراچی کور میں بریگیڈیئر کے رینک میں

کروشیا میں مسلم املاک کو بہت نقصان پہنچا

مرد شہید کئے گئے، عورتیں بڑی تعداد میں

اغواء کر لی گئیں، بچے لاپتہ ہو گئے

Scanned with CamScanner

دہائیوں سے یوگوسلاویہ کی سماجی روایات میں شادی سے پہلے فرینڈ شپ کا عمل ضروری تھا، یہ تمام فرقوں میں رائج تھا، مسلمان ابتداء میں ہچکچاتے رہے تاہم وہ بھی علاقائی رسومات اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے

کمانڈر کور انجینئرز تھے۔ پاکستان آرمی کے قابل فخر کور آف انجینئرز کے مایہ ناز افسر اور انتہائی خوش اخلاق شخصیت تھے۔ میں نے انہیں لیفٹیننٹ کرنل کے رینک میں شاہراہ قراقرم پر فرائض انجام دیتے دیکھا تھا۔ میں چین اور پاکستان کو ملانے والی عظیم شاہراہ پر ایک دستاویزی فلم کی تکمیل کے لیے آئی ایس پی آر کی ٹیم کے ساتھ محو سفر تھا کہ لیفٹیننٹ کرنل جہانگیر نصر اللہ کی یونٹ میں کچھ دن کے لیے سرکاری پڑاؤ کیا۔ وہ چند روز ہم سب کے دل میں گھر کر گئے دراصل ہم ایک اور یونٹ کے کمانڈنگ افسر کے ''حسن سلوک'' سے سردی میں لرزہ براندام تھے۔ شدید بارش میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ٹینٹ میں رہائش اور چائے پانی کی فراہمی کمانڈنگ افسر کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ ہم آئی ایس پی آر کے کیپٹن تھے، جنرل محمد ضیاء الحق نے ویسے ہی ''صولت صاحب'' کا اعزازی رینک عطا کیا ہوا تھا۔ کپکپی کے ساتھ انتظار کی گھڑیاں طویل ہو گئیں تو پتہ چلا کہ موصوف (کمانڈنگ افسر) عبادت میں مصروف ہیں۔ فی الحال کسی کو خلل کی اجازت نہیں۔ دراصل شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے دوران مشہور زمانہ کتاب ''موت کا منظر (مرنے کے بعد کیا ہوگا) عرف ''حسن پرستوں کا انجام'' متعدد افسروں اور جوانوں کے پاس موجود رہتی تھی۔ بلند و بالا پہاڑ، ایک پتلی پگڈنڈی پر خیمہ زن، نیچے رسی کی مانند بل کھاتا ہوا دریا۔ سورج ڈھلتے ہی ہر طرف سناٹا اور ہو کا عالم۔ کسی کو پہاڑ کی چوٹی پر جنات دکھائی دیتے تو کوئی دریا کنارے پریوں کے وجود کی قسمیں اٹھاتا دکھائی دیتا تھا۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بعد متعدد بار خنجراب تک سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ جنات اور پریوں کے وجود کا احساس دراصل آکسیجن کی کمی کے باعث رونما ہوتا ہے۔ عبادت گزار اور پرہیز گار کمانڈنگ افسر کی یونٹ کو خیر باد کہا۔ کچھ فاصلہ طے کر کے شاہراہ قراقرم پر خیمہ زن ایک اور یونٹ میں پہنچے جہاں لیفٹیننٹ کرنل جہانگیر نصر اللہ پذیرائی کے لیے موجود تھے۔ کراچی میں بھی ان سے بالواسطہ رابطہ رہا۔ آئی ایس پی آر کے سربراہ مقرر ہوئے تو جنرل آصف نواز نے مجھے انتباہ کیا: ''یہ میری سلیکشن ہے۔ تم آئی ایس پی آر والے اپنے آدمی کے سوا کسی کو ''تسلیم'' نہیں کرتے۔ جہانگیر نصر اللہ کو کامیاب کرانا تمہاری ذمہ داری ہے''۔ انہیں ڈی جی آئی ایس پی آر تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ کراچی آپریشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ انہیں سندھ میں دفاعی اور غیر دفاعی مقاصد کے لیے تعمیر کی گئی سڑکیں، خفیہ راستے، دشمن کے لیے مستقل اور عارضی رکاوٹیں سمیت مزید آپریشنل اقدامات کی تفصیلات کا علم تھا لیکن سندھ کے میڈیا کا آپریشن میں کردار کا تعین ایک دشوار چیلنج تھا۔ بنیادی شرط میڈیا مالکان اور صحافیوں کے نظریات اور خیالات سے آگاہی تھی۔ بہر حال میجر (بعد میں لیفٹیننٹ کرنل) عبدالخالق چشتی پی آر او کراچی کور کو یہ اہم

Scanned with CamScanner

فرض سونپا گیا۔ جب آپریشن لانچ ہو گیا تو مجھے بھی کراچی کور سے منسلک کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد جی ایچ کیو سے سائیکلو جیکل وار فیئر ڈائریکٹوریٹ کے سربراہ بریگیڈیئر آصف ہارون بھی کراچی تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ ان کے سٹاف افسر لیفٹیننٹ کرنل ارشد علوی بھی تھے جو ایم اے صحافت پنجاب یونیورسٹی میں میرے ہم جماعت رہ چکے تھے۔

کراچی آپریشن ایک طویل داستان ہے جس کا ذکر گاہے بہ گاہے ہوتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے سول انتظامیہ نے جب آرمی کی مدد طلب کی تو مکمل چھان بین کے بعد منصوبہ بندی کی گئی۔ بھارت کی کراچی کو نشانہ بنانے کی کوشش کے بارے میں تمام معلومات موجود تھیں۔ مشرقی پاکستان میں شورش کے انداز پر وسیع پیمانے کی گڑبڑ کا پروگرام تھا۔ الطاف حسین کی جماعت سے منسلک بعض افراد نے رضا کارانہ طور سے معلومات فراہم کیں۔ ایم کیو ایم کی بھاری اکثریت کا ان افراد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہر حال ایم کیو ایم وقت گزرنے کے ساتھ لسانی بنیاد پر شہری سندھ کی مضبوط، توانا اور ناقابل چیلنج سیاسی حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔ ہر ملٹری آپریشن کی مخصوص جہتیں ہوتی ہیں۔ خاص طور پر شہری علاقوں میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ آپریشن لانچ ہو گیا تو سب سے پہلے وزیر اعظم میاں نواز شریف کے دو قریبی ساتھیوں چودھری نثار علی خان اور غلام حیدر وائیں نے اعتراضات اٹھانے شروع کر دیئے۔ یہ صورتحال فوج اور بالخصوص آرمی چیف کے لیے خاصی ناخوشگوار تھی۔

حقیقت ہے کہ آپریشن کے حوالے سے ہر قدم جمہوری حکومت کی مکمل آشیر باد ہی سے اٹھایا جا رہا تھا۔ صدر اور وزیر اعظم نے ہر بریفنگ میں شرکت کی تھی۔ اخبارات میں ایم کیو ایم کے حامی موجود تھے۔ انہوں نے چودھری نثار علی خان اور غلام حیدر وائیں کے بیانات کو خوب اچھالا اور حاشیہ آرائی کی۔ دونوں بیانات میں آرمی کی آپریشن میں شرکت کے حوالے سے آئین کی شق 147 اور 245 میں درج تفصیلات کی تکمیل کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ آپریشن بھی چلتا رہا اور بیانات در بیانات کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

بیس جولائی 1992ء کو جنرل ہیڈ کوارٹرز میں ایک اہم کانفرنس ہوئی جس میں صدر غلام اسحاق خان، وزیر اعظم نواز شریف، وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین، وزیر اعلیٰ سندھ مظفر حسین شاہ، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی جنرل شمیم عالم خان، چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز، چیف آف نیول سٹاف ایڈمرل سعید محمد خان، چیف آف ایئر سٹاف ایئر چیف مارشل فاروق فیروز خان، کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل محمد نصیر اختر اور دیگر متعلقہ سینئر سول اور آرمرڈ فورسز افسروں نے شرکت کی۔ اس میٹنگ میں آپریشن کے بارے میں کھل کر گفتگو ہوئی۔ جنرل آصف نواز نے واضح طور پر کہا کہ فوج کا کوئی سیاسی کردار نہیں، ہم جمہوری

ہم نے علاقے میں پاکستان ساختہ فٹ بال تقسیم کیے

یہ سرب کھلاڑیوں کے لیے ایک بہترین تحفہ تھا

یوں ''تعلقات عامہ'' مزید خوشگوار ہو گئے

Scanned with CamScanner

یواین مشن کے سربراہ امریکی زائد ممالک پر مشتمل یواین آرمی کی قیادت بیلجیم فوج کے میجر جنرل شکوپس کررہے تھے، یہ دونوں ہمیشہ پاک فوج کی خدمات کا برملا اعتراف کرتے اور پاک فوج کے دستے کو ''مثالی'' قرار دیتے تھے

حکومت کے مکمل تابع ہیں۔ تین گھنٹے طویل میٹنگ کے بعد پریس ریلیز تیار کیا گیا جس میں سب نے اپنا حصہ ڈالا۔ آرمی چیف بار بار کہتے تھے کہ ہمیں سیاست سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہمیں ان کاموں میں مت الجھاؤ۔ خود حل کروا پنے مسائل۔ غیر رسمی بات ہورہی تھی۔ پریس ریلیز تیار ہوگیا۔ آرمی چیف نے منظوری دے دی تو کہنے لگے کہ وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین سے منظوری ضروری ہے۔ میں پریس ریلیز لے کر چودھری صاحب کے ہاں پہنچا تو انہوں نے کہا کہ کرنل صاحب آپ پڑھ کر سنا دیجیے۔ ان کے سٹاف افسر ساجد چٹھہ بھی موجود تھے۔ ساعت کے بعد کہنے لگے کہ ''میرا خیال ہے کہ وزیراعظم صاحب کو بھی دکھا دیتے ہیں''۔ یوں چودھری صاحب کے ہمراہ وزیراعظم صاحب کی منظوری کے لیے روانہ ہوئے۔ معلوم ہوا کہ میاں نواز شریف کسی تقریب میں ہیں۔ بہر حال چودھری صاحب نے پریس ریلیز ان کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) عبدالقیوم کو دیا جنہوں نے سٹیج پر فائل وزیراعظم کو دکھائی۔ انہوں نے سرسری نگاہ ڈالی اور ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ حتمی منظوری کے لیے صدر صاحب سے رابطہ کریں۔ ادھر میڈیا سے ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ آئی ایس پی آر آفس سے کرنل (بعد میں بریگیڈیئر) ایس ایم اے اقبال پوچھ رہے تھے کہ آپ کہاں ہیں؟ جلدی واپس آئیے۔ منظوری کیوں نہیں ملی؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ ایک معمول کا پریس ریلیز آرمی چیف، وفاقی وزیر داخلہ اور وزیراعظم سے ہوتا ہوا اب صدر مملکت کی خدمت میں پیش ہونے جا رہا ہے۔ ملٹری سیکرٹری نے جب صدر مملکت سے منظوری کی شرط عائد کی جو دراصل وزیراعظم نواز شریف کے احکامات تھے تو وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین نے کہا کہ ''کرنل صاحب! بابے کول تسی آپے جاؤ!'' (بابے کے پاس آپ خود جائیں)۔

میں ایوان صدر پہنچا تو اے ڈی سی ٹو صدر مملکت نے بتایا کہ جناب غلام اسحاق خان عصر کی نماز ادا کر کے تشریف لائیں گے۔ آپ انتظار کریں۔ میں نے میڈیا، پریس گلوبل ویلج وغیرہ کی اصطلاحات سے اپنی بات کی اہمیت واضح کی لیکن موصوف ٹس سے مس نہ ہوئے کہنے لگے ''سر! آپ میری پوزیشن سمجھیں، میں فیملی ایریا میں داخل نہیں ہوسکتا''۔ خیر نماز عصر ادا کر کے صدر مملکت تشریف لائے۔ اے ڈی سی پریس ریلیز لے کر چلا گیا۔ چائے کا ایک اور دور شروع ہوگیا۔ آدھ گھنٹہ، ایک گھنٹہ مزید بیت گیا۔ پتہ چلا کہ صدر مملکت ابھی تک پریس ریلیز ہی کو ''دیکھ'' رہے ہیں۔ مغرب کی اذان ہوئی تو اے ڈی سی وزیٹر روم میں آئے اور ترمیم شدہ پریس ریلیز میرے حوالے کر دیا۔ جناب صدر نے باریک پنسل سے صفحہ دو پر متعدد جملے تبدیل کیے تھے۔ ایک باریک بین ایڈیٹر کی مانند کہیں تیر کا نشان تھا اور ایک

Scanned with CamScanner

دو جگہ پر ''ڈبے'' بنے ہوئے تھے جن میں کچھ تحریر تھا۔ کاغذ کا حاشیہ بھی خالی نہیں تھا۔ میں نے اے ڈی سی سے کہا کہ کسی ایسے ٹائپسٹ کو بلائیں جو صدر کی تحریر پڑھ سکتا ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ سر! مغرب ہو گئی ہے اور سب لوگ چلے گئے ہیں۔ میں نے آئی ایس پی آر اطلاع دی کہ صفحہ اول پر صرف دو ترامیم ہیں، یوں لگتا ہے کہ ایک پر خط تنسیخ ہے البتہ صفحہ دو ''اٹھاون بی'' بنا ہوا ہے۔ میرا خیال تھا کہ کرنل ایس ایم اے اقبال مزاح سے مستفید ہوں گے لیکن انہوں نے اپنی طبیعت کے برعکس بے نقط سنانا شروع کر دیں کہ آپ مذاق پر تلے ہوئے ہیں۔

بہرحال اسلام آباد سے راولپنڈی جانے والی سڑک پر ''حدر فتار'' کو توڑتا ہوا آئی ایس پی آر پہنچا تو موقع پر موجود افسروں نے صدر مملکت کی باریک پچی پنسل سے لکھی ہوئی تحریر کو ''ڈی کوڈ'' کیا۔ پی ٹی وی کے خبر نامے کا وقت قریب تھا۔ چند لائن ٹائپ ہوتے ہی فیکس مشین کے حوالے ہو جاتی تھیں۔ عجب گھمسان کا رن تھا۔ ایک سیدھا سادہ پریس ریلیز جو زیادہ سے زیادہ آئی ایس پی آر اور وزارتِ داخلہ کے پی آر او کے باہمی اشتراک سے جاری ہونا تھا۔ 1973ء کے آئین کے تناظر میں آرمی چیف اور وزیراعظم سے ہوتا ہوا صدر مملکت تک پہنچا جنہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور تجربہ بروئے کار لاتے ہوئے اسے نشر و اشاعت کے قابل بنایا۔ قصہ مختصر کراچی آپریشن بھی مذکورہ پریس ریلیز کی مانند ہی رواں دواں رہا۔ فوجی دستے کراچی کور کی نگرانی میں اپنی آئینی ذمہ داریاں مکمل کر رہے تھے۔ متعدد افسر اور جوان شورش پسندوں کا نشانہ بنے۔ مجھے آج بھی دو آرمی کیپٹن کی نعشیں یاد ہیں جنہیں بھارت کے تربیت یافتہ دہشت گردوں نے اغواء کر کے ٹارچر کیا اور پھر انہیں شہید کر دیا۔ آئی ایس پی آر نے بھرپور انداز میں بحالی امن کے لیے فوج کی شب و روز خدمات کو اجاگر کیا۔ یہ ایک بہت مشکل فریضہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اندرون ملک سلامتی کے آپریشن کے دوران بعض بے گناہ معصوم افراد بھی نادانستہ طور پر زد میں آتے ہیں۔ ان کی دلجوئی اور دیکھ بھال کے لیے خصوصی ہدایات تھیں۔ ایم کیو ایم بھی انتشار کا شکار ہوگئی۔ آفاق احمد نے ایم کیو ایم حقیقی کی داغ بیل ڈالی۔ پارٹی چیئرمین عظیم احمد طارق پراسرار انداز میں قتل کر دیئے گئے۔ روشنیوں کا شہر خوف، دہشت اور بے یقینی کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ آرمی آپریشن کے ساتھ سیاسی عمل بھی ضروری تھا لیکن اس حوالے سے میاں نواز شریف کی حکومت گومگو کا شکار تھی۔ محض چند ارب کے ترقیاتی منصوبوں کے اعلانات کافی نہیں تھے۔ کراچی والے اپنا کراچی واپس مانگ رہے تھے۔ سب کو اس مطالبے سے اتفاق تھا لیکن حصول کے لیے ''سیاسی عزم'' کا فقدان تھا۔ پیپلز پارٹی کا اصل حوالے سے ظاہر اور باطن ایک نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اندرون سندھ کا ووٹر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند

وزیراعظم نواز شریف سے منسوب یہ بیانیہ عام کیا جانے لگا کہ معرکہ کارگل ان کی اجازت کے بغیر شروع کیا گیا تھا

Scanned with CamScanner

شیخ مجیب الرحمٰن ''بنگلہ بندھو'' بن گئے اور ذوالفقار علی بھٹو نے ''قائد عوام'' اور ''فخر ایشیاء'' کے القاب اپنا لیے، جواب دہی کے لیے فوج کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا

ان کے ساتھ ہے۔ سیاستدانوں کی باہمی ریشہ دوانی اور سطحی سوچ کے باعث آپریشن کے حوالے سے فوج دباؤ کا شکار رہی۔ جنرل آصف نواز کی تشویش میں بھی اضافہ ہو رہا تھا جس کا اظہار انہوں نے متعدد میٹنگز میں کیا۔ صدر مملکت، وزیر اعظم اور آرمی چیف کے متعدد مشترکہ اجلاس ہوئے۔ اس کے باوجود فضا سیاسی لحاظ سے گرد آلود رہی۔

کراچی کی مخصوص جغرافیائی اور معاشی اہمیت کے باعث بھارت کی مداخلت کے ثبوت بھی موجود تھے، یہ صورتحال سیکورٹی ایجنسیز کے لئے ہمیشہ چیلنج رہی ہے۔ خاص طور سے جب دشمن کے ایجنٹ ریاست کے ستونوں میں سرگرم دکھائی دیں تو معاملات کو سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔ بھارت نے سندھ کو ہمیشہ ٹارگٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ 1965ء اور 71ء کی جنگوں میں بھرپور حملے کیے گئے جنہیں پاک افواج نے کامیابی سے پسپا کیا۔ پاک بحریہ کا انتہائی اہم بیس ہونے کی وجہ سے بھارت کراچی کو امن دشمن کارروائیوں کے لیے ''مناسب'' سمجھتا ہے۔ بدقسمتی سے کراچی سیاسی، معاشی اور سماجی لحاظ سے بھی تقسیم در تقسیم کا شکار رہا ہے۔ فرقہ واریت ایک اور عفریت ہے جس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ معاشی لحاظ سے طاقتور اقلیتی برادری جن میں پارسی اور ہندو سرفہرست ہیں دنگا فساد اور بے یقینی کی فضا سے بہت جلد پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ان میں ترک وطن کرنے والے زیادہ تعداد میں ہیں۔ کراچی آپریشن کے دوران مہاجر کارڈ کی دعوے دار صرف الطاف حسین کی ایم کیو ایم ہی نہیں تھی بلکہ آفاق احمد، ڈاکٹر سلیم حیدر اور دیگر جماعتوں میں شامل اردو بولنے والے سیاسی رہنما بھی اپنا حصہ ڈالتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ آپریشن کے دوران متعدد ایسے افراد بھی گرفتار ہوئے جو بھارت سے تخریبی کارروائیوں کی تربیت حاصل کر کے آئے تھے۔ ایم کیو ایم الطاف حسین کا دفتر نائن زیرو سیاست کم اور امن دشمن کارروائیوں کے لئے زیادہ استعمال ہوتا رہا۔ اس کے باوجود کور ہیڈ کوارٹرز میں یہ رائے موجود تھی کہ ایم کیو ایم کی سیاسی بنیاد کو ختم کرنا دشوار ہے، مناسب ہوگا کہ اسے صحیح راستے پر گامزن کیا جائے تاکہ ماضی کی طرح مہاجر برادری پاکستان کی ترقی اور فلاح میں اہم کردار ادا کر سکے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے پاس فوج کو تھپکی دینے کے سوا کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔ اندرون سندھ سے تعلق رکھنے والے سیاسی رہنما ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ اوّل یہ کہ فوج کراچی میں اردو بولنے والی مہاجر کمیونٹی کی نظر میں متنازع بن جائے اور دوم ایم کیو ایم کو سیاسی لحاظ سے زندہ درگور کر دیا جائے۔ جماعت اسلامی ایم کیو ایم سے سیاسی زک اٹھانے کے باعث گوشہ تنہائی میں تھی۔ محض اکا دکا بیانات سے سیاست چل رہی تھی۔ زمینی حقائق کے مطابق کراچی میں برسوں سے مقیم پختون، پنجابی اور دیگر برادریاں ایم کیو ایم کی لسانی سیاست

سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے آپریشن کی حمایت کر رہی تھیں۔ اس پس منظر کے ساتھ آپریشن نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ معاشی، تعلیمی اور سماجی گہما گہمی واپس آ گئی اور لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ فوج کی تجویز پر سول آرمرڈ فورسز کی تشکیل کا فیصلہ ہوا اور ''مہران فورس'' کے نام سے نیم فوجی دستے تیار کیے گئے جو سندھ پولیس کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار تھے۔ مہران فورس کی بعد میں پاکستان رینجرز سندھ کے نام سے تشکیل نو کی گئی۔ یہ فورس آج بھی سندھ صوبے میں امن و امان کی بحالی کے لیے امداد میں مصروف ہے۔ بدقسمتی سے سندھ پولیس افرادی قوت اور مناسب ساز و سامان کے باوجود اپنی بنیادی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہی ہے۔ خاص طور سے بڑے شہروں میں رونما ہونے والے جرائم پر کنٹرول کرنا دشوار تھا۔ اس تساہل کے متعدد اسباب تھے۔ خاص طور سے افرادی قوت کی غیر منصفانہ بھرتی اور سیاسی مداخلت اہم ترین نکات تھے۔ جن کا ہر اہم میٹنگ میں ذکر ہوتا تھا لیکن میٹنگ میں شامل اکثر سیاسی رہنما زیر لب مسکرا کر موضوع بدل دیتے تھے۔ عسکری قیادت ایک حد تک اصرار کر سکتی تھی، ملیر چھاؤنی میں ایلیٹ فورس کے قیام کے لیے سنٹر بنایا گیا۔ اتفاق سے میرے ایک کورس میٹ میجر احتشام کی خدمات حاصل کی گئیں جو پاکستان آرمی کے سپیشل سروسز گروپ (ایس ایس جی) کے مایہ ناز کمانڈو افسر تھے۔ انہیں سندھ پولیس کے چنیدہ اسسٹنٹ سب انسپکٹرز کو خصوصی ٹریننگ دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ میجر احتشام سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو موصوف پولیس کی وردی میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ میں نے رائے دی کہ پولیس کے ساتھ مختصر وقت گزارنا ورنہ آپ کسی کے نہیں رہو گے۔ پولیس قبول نہیں کرے گی کہ ایک فوجی افسر ہم پر ''مسلط'' ہو گیا ہے اور جب واپس فوج میں جاؤ گے تو وہاں ''دل'' نہیں لگے گا۔ پولیس سروس میں بسر کیے شب و روز یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرو گے۔ میجر احتشام نے حسب معمول ایک زوردار قہقہہ لگایا اور میری بات سنی ان سنی کر دی۔ چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ ایک روز ٹیلی فون پر میجر احتشام پریشانی کے عالم میں کہہ رہے تھے: ''یار صولت رضا! ملیر سے پولیس والے جلوس کی صورت میں کراچی سی پی او آفس کی طرف آ رہے ہیں۔ انہیں سخت ٹریننگ پر اعتراض ہے، کہتے ہیں ہم سے فوجی تربیت نہیں ہوتی ہے''۔ میجر احتشام مسلسل بات کر رہے تھے۔ اب زوردار قہقہہ بلند کرنے کی باری میری تھی۔ میں نے کہا کہ ''برادر عزیز میں نے پہلے دن ہی گزارش کی تھی کہ سندھ پولیس کے موجودہ اے ایس آئی ایک مخصوص خاندانی پس منظر اور سیاسی تال میل کے باعث بھرتی ہوئے ہیں۔ انہیں آپ نماز فجر کے بعد دو میل بھگاتے ہیں، پریڈ کراتے ہیں اور پھر کلاسز کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہ بے چارے اگر اتنے ہی تندرست و توانا تھے

وزیر اعظم نے آرمی چیف کو ہٹانے کے لیے جو
طریقہ اپنایا وہ ہر لحاظ سے ملکی سلامتی اور پاک افواج
ایسے ادارے کے عزت و وقار کے منافی تھا

Scanned with CamScanner

مشرف کو فارغ کر کے اگر اپنی مرضی کا ایک اور آرمی چیف تعینات کرنا مقصود تھا تو اس کا ایک ''شریفانہ'' طریقہ بھی موجود تھا مگر میاں نواز شریف نے آرمی چیف کے بارے بچگانہ انداز میں احکامات صادر کر دیئے

تو فوج میں بھرتی ہو جاتے''۔

میجر احتشام کا اصرار تھا کہ اخبار میں نہیں آنا چاہیے۔ بہر حال اگلے دن اچھا برا شائع ہو گیا اور ایک نئی بحث چھڑ گئی کہ آیا موجودہ افرادی قوت میں سے انتخاب کیا جائے یا ایلیٹ فورس کے لیے خصوصی بھرتی ہونی چاہیے۔ سندھ پولیس کے اعلیٰ افسران بھی ''تربیت'' کا معیار ایک حد تک ہی رکھنے کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کچے کے علاقے میں برسوں سے مقیم ڈاکوؤں یا کراچی کے مختلف اضلاع میں سرگرم جرائم پیشہ ''معززین'' ان سب سے نبرد آزما ہونے کے لیے روایتی طریقہ کار موجود ہے۔ میجر احتشام کی نافذ کردہ عسکری تربیت سے سندھ پولیس کا مورال انتہائی متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ احتجاج کرنے والے پولیس اہلکار ''شدت تربیت'' سے نڈھال تھے۔ بہر حال نامساعد حالات کے باوجود میجر احتشام نے پیشہ وارانہ لحاظ سے بہترین تربیت دی۔ پاسنگ آؤٹ کے موقع پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں شہباز شریف بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ انہوں نے سندھ پولیس کے چاق و چوبند دستے دیکھے تو ٹریننگ انچارج سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے میجر احتشام کو پنجاب پولیس میں ایلیٹ فورس قائم کرنے اور تربیت دینے کی دعوت دی۔ نسبت روڈ لاہور سے آبائی تعلق رکھنے والے میجر احتشام کو اور کیا چاہیے تھا۔ انہوں نے سندھ حکومت سے اجازت طلب کی جو بادل نخواستہ عطا کر دی گئی۔ میں ابھی کراچی آئی ایس پی آر میں ہی تھا۔ لاہور روانگی سے پہلے ملاقات ہوئی تو میں نے دوستانہ انداز میں مشورہ دیا کہ پنجاب پولیس سے بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ۔ سندھ کی ''سائیں پولیس'' کے ساتھ ''تعلقات عامہ'' استوار ہو گئی تھی۔ پنجاب پولیس سے انگریز بھی پناہ مانگتا تھا۔ وردی میں ''سائیں'' نے صرف جلوس نکالنے پر اکتفا کیا ہے پنجاب پولیس والے سبق سکھانے پر یقین رکھتے ہیں۔ میجر احتشام کے ساتھ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایلیٹ فورس پنجاب کو تربیت دینا شروع کر دی۔ پولیس سروس کے چند افسر بھی ہمراہ تھے۔ یہ ایس ایس جی کا کمانڈو دن رات فیلڈ میں زیر تربیت اہلکاروں کے ساتھ مصروف عمل تھا۔ دفتری معاملات اور مالی امور کی دیکھ بھال غیر روایتی تھی لہذا کچھ عرصے بعد تربیت پس منظر میں چلی گئی اور انکوائریاں شروع ہو گئیں۔ یہ طویل کہانی ہے۔ میجر احتشام کی روداد جوانمردی کو سمیٹتے ہوئے یہ کہنا ہی کافی ہو گا کہ ایس ایس جی افسر جو نیک نیتی کے ساتھ پولیس کو اعلیٰ تربیت پیشہ وارانہ تربیت سے سرفراز کرنا چاہتا تھا پولیس نظام کے ہاتھوں جکڑا گیا۔ اس دوران جنرل پرویز مشرف برسر اقتدار آ گئے۔ احتشام ایس ایس جی کے زمانے میں ان کا عزیز ترین جونیئر افسر تھا۔ لہذا وہ ساری فائلز بغل میں دابے راولپنڈی آ گیا۔

Scanned with CamScanner

جنرل مشرف سے ملاقات کے بعد مجھے ملا تو کہنے لگا کہ آرمی چیف نے رات کے کھانے پر بلایا ہے اور ایس ایس جی کے زمانے کی یادیں تازہ کی ہیں۔ شہیدوں کے کارنامے دہرائے، جب میں نے اپنی کہانی بیان کی تو جنرل مشرف نے کہا کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم پولیس میں جاؤ۔ اگر گئے تھے تو پھر پولیس والے بن جاتے، اب قانونی لڑائی وکیل کے ذریعے لڑنا ہوگی۔ یوں جنرل مشرف نے براہ راست مداخلت سے معذرت کر لی۔ کچھ عرصہ بعد احتشام تعزیرات پاکستان کی زد میں آ گیا، مدت تک قید و بند کی صعوبت برداشت کی۔ سیاستدان ہوتا تو یہ بات کریڈٹ میں جاتی، ادھر صورتحال یکسر مختلف تھی۔ اس پر جو گزری وہ ہمارے سرکاری، سماجی اور سیاسی کلچر کو بے نقاب کرتی ہے۔

خیر میں نے بات جنرل آصف نواز کے زمانے میں جاری کراچی آپریشن سے شروع کی تھی۔ اس آپریشن کے حوالے سے لاتعداد ذیلی واقعات بھی ہیں۔ کچھ امانت کے طور پر دفن رہیں گے البتہ ایسے حالات جن کا مستقبل میں بھی سامنا ہو سکتا ہے انہیں بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کراچی آپریشن میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز 8 جنوری 1993ء کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ انہوں نے 16 اگست 1991ء کو پاکستان آرمی کی کمان سنبھالی تھی۔ وہ بظاہر ہشاش بشاش تھے اور معمول کے مطابق اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ کور کمانڈر کراچی تعینات ہو گئے تو میں آئی ایس پی آر کراچی آفس میں تھا۔ یوں ان سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات کا موقع میسر آتا تھا۔ وہ ایک سچے کھرے اور پیشہ وارانہ معاملات کو ہر قیمت پر ترجیح دینے والے ایک باوقار افسر تھے۔ سپورٹس اور ذاتی فزیکل فٹنس پر خاص توجہ دیتے۔ آرمی چیف کی حیثیت سے بھی جاگنگ اور واک وغیرہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انتقال سے چند روز قبل ایک ''ٹی بریک'' کے دوران ''اِن ڈور'' جاگنگ مشین کی تعریف کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موسم خراب ہونے کی صورت میں بھی رننگ جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اس موقع پر کسی افسر نے کہا کہ جاگنگ مشین کو زیادہ استعمال کرنے کے نقصانات بھی ہیں۔ شنید ہے کہ جنرل آصف نواز کو یہ مشین کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی متعدد افواہیں گردش میں تھیں۔ کراچی آپریشن کے حوالے سے بھی خفیہ رپورٹس مل رہی تھیں کہ امن دشمن بھارت کی اعانت سے آرمی کی سینئر قیادت کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ کچھ دور کی کوڑی لائے کہ ناراض سیاست کار کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ واقعہ کچھ یوں ہوا کہ چھٹی کے دن جنرل آصف نواز حسب معمول آرمی ہاؤس کے کشادہ لان میں جاگنگ اور واک کر رہے تھے کہ اچانک دل میں درد اٹھا اور زمین پر ہی لیٹ گئے۔ کسی کی نظر پڑی تو یہ سمجھا کہ

لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے میرے پاس آئے اور فرمانے لگے سر! بات ہو گئی ہے جنرل ضیاء الدین کے ساتھ پی آر او کی ڈیوٹی میں کروں گا، وہ مجھے خوب جانتے ہیں

Scanned with CamScanner

> آج جب مڑ کر دیکھتا ہوں تو سیاست کے میدان اور حکمرانی کے ایوانوں میں پورے قد کے رہنما بہت کم اور ''بونے'' زیادہ دکھائی دیتے ہیں

آرام یا ایکسرسائز کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد بیگم آصف نواز نے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ لان میں نیم بے ہوش پڑے ہیں۔ فوری طور پر سٹاف کار میں ہی آرمرڈ فورسز انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی پہنچایا گیا۔ ایمبولینس گھر پر موجود نہیں تھی۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز نے ابتدائی طبی امداد دی۔ سینئر ڈاکٹر بھی پہنچ گئے۔ تمام تر طبی کوششوں کے باوجود جنرل آصف نواز جانبر نہ ہو سکے۔ اگلے روز انہیں آبائی گاؤں چکری راجگان کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ کور کمانڈر لاہور لیفٹیننٹ جنرل اشرف چودھری سب سے سینئر لیفٹیننٹ جنرل تھے لہذا انہوں نے کمان سنبھال لی۔ چند روز بعد صدر غلام اسحاق نے کور کمانڈر کوئٹہ لیفٹیننٹ عبدالوحید کاکڑ کو چیف آف آرمی سٹاف مقرر کر دیا۔

نئے آرمی چیف کے ساتھ بھی میری پریس رابطہ افسر کی حیثیت سے ڈیوٹی جاری تھی کہ ایک روز عجیب واقعہ ہو گیا اور مجھے دوبارہ اسی انداز میں کراچی جانا پڑا جیسا کہ لاہور سے بریگیڈیئر صدیق سالک شہید نے مجھے لاہور سے کراچی روانہ کیا تھا۔ چھٹی کا دن تھا اور ابھی تمام اخبارات میز پر ہی موجود تھے کہ ملازم نے اطلاع دی کہ باہر ایک صاحب کار میں موجود ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ صولت صاحب کو فوراً بھیجو۔ میں پریشان ہو گیا۔ ملازم سے حلیہ، گاڑی کا رنگ وغیرہ پوچھتے ہوئے گیٹ سے تانک جھانک کی تو ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ اپنی ذاتی کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے دکھائی دیتے۔ میں معمول کی شلوار قمیض اور سلیپر پہنے ہوئے تھا۔ جونہی گیٹ کھولا انہوں نے گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ تیزی سے گاڑی ریورس کی اور باہر مین روڈ پر آ گئے۔ بات سلام دعا سے شروع ہوئی تھی۔ میں بھی پریشان تھا، انہوں نے نصرت فتح علی خان کی آواز میں قوالی ''علی مولا۔ علی مولا'' اونچی آواز میں آن کر دی۔ یہ صورتحال مزید پریشان کن تھی۔ میں نے بھی اونچی آواز میں پوچھا سر! خیریت تو ہے، آپ ٹھیک ہیں؟ انہوں نے سٹیرنگ مضبوطی سے تھامے ہوئے بولنا شروع کر دیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے 102 درجے کا بخار ہے اور آرمی چیف نے مجھے آدھا گھنٹہ کھڑا کیے رکھا ہے۔ بے نقط سنائی ہیں۔ ایسے الفاظ میں نے پوری سروس میں نہیں سنے۔ کاش! میں تمہارے آئی ایس پی آر میں نہ آیا ہوتا۔ کراچی میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔

کراچی میں آئی ایس پی آر کے لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی نے کسی کار چور کی پریس کانفرنس کروا دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں صدر غلام اسحاق خان کے داماد عرفان اللہ مروت کا آدمی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ آج اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ صدر مملکت نے آرمی چیف سے پوچھا کہ ''تمہارا آئی ایس پی آر مجھے ''ڈاؤن'' کرنے پر لگا ہوا ہے، آخر کیوں؟'' آرمی چیف عبدالوحید کاکڑ نے مجھے صبح صبح بلا لیا۔ اب ہم دونوں دفتر جا رہے ہیں۔ تم نے فوراً

کراچی جانا ہے اور چشتی سے چارج لینا ہے۔ چیف بہت ناراض ہیں۔ انہوں نے مجھے واضح احکامات دیے ہیں۔ میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ خود گاڑی چلاتے ہوئے دفتر داخل ہوئے تو چھٹی کے روز موجود دو تین افراد پر مشتمل عملہ پریشان ہو گیا۔ جنرل صاحب واقعی پریشان تھے۔ ساری سروس کور آف انجینئرز سے منسلک رہے۔ اب میڈیا سرکس کا سامنا تھا۔ بہرحال میس سے کافی منگوائی۔ میں نے بھی ساری خبر اونچی آواز میں پڑھی کیونکہ جنرل صاحب کے لیے اس وقت مطالعہ ممکن نہیں تھا۔ کراچی میں لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی سے بات کی تو وہ حسب معمول مطمئن اور اپنے کارنامے پر شاداں تھے۔ جب میں نے انہیں صورتحال سے آگاہ کیا تو پریشان ہو گئے۔ ان کا اصرار تھا کہ مبینہ کار چور کی پریس کانفرنس متعلقہ حکام کی اجازت سے کی گئی ہے اور یہ سارا معاملہ کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل نصیر اختر کے بھی علم میں ہے۔ بہت بڑا کار چور ہے۔ یہ سرکاری گاڑیاں بھی چوری کرتا ہے اور صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) بھجواتا ہے۔ چند اردو اخبارات نے خبر سپر لیڈ کے طور پر نمایاں کی تھی۔ اب معاملہ چشتی صاحب کی گردن ماپنے کا تھا۔ میرا اصرار تھا کہ اگر ہمارے کولیگ کو اس بنیاد پر ''فارغ'' کیا گیا تو آئی ایس پی آر کی تاریخ میں ذکر ہو گا کہ ادارے کا سربراہ اپنے ایک بہترین اور باصلاحیت افسر کا پیشہ وارانہ انداز میں دفاع نہیں کر سکتا۔ میں نے تجویز دی کہ فی الحال سب کو غصہ ہے۔ شام تک کوئی اور خبر اس خبر پر بازی لے جائے گی۔ آپ آرمی چیف کے احکامات کے مطابق لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی صاحب کو کراچی آفس سے تبدیل کر کے راولپنڈی یا ملتان تعینات کر دیں۔ اس دوران میجر جنرل جہانگیر نصر اللہ بھی مزید ٹیلی فون کالز کی ''زد'' میں تھے۔ بہرحال مجھے ایک بار پھر کراچی کا ''سامنا'' تھا۔ اُدھر ہمارے دوست چشتی صاحب کی کیفیت بھی ڈی جی آئی ایس پی آر سے کم نہیں تھی۔ وہ اپنے کارنامے پر متعدد اخبارات سے ادارتی نوٹ اور کالم وغیرہ شائع کروانے کی درخواست کر چکے تھے۔ رہی سہی کسر پی ٹی وی کے خبر نامے پوری کر رہے تھے۔ البتہ کار چور کے مبینہ بااثر افراد سے رابطے کا ذکر نہیں تھا۔ رات گئے کراچی پہنچا تو آفس میں خاصی چہل پہل تھی۔ آفس ٹیبل کی ایش ٹرے چشتی صاحب کے پھونکے ہوئے سگریٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی سراپا صحافی تھے۔ انہیں اردو انگلش زبان میں خبر سازی پر خاصا عبور تھا۔ آئی ایس پی آر میں شمولیت سے پہلے متعدد اردو اور انگریزی اخبارات سے منسلک رہے۔ موصوف بریگیڈیئر تفضّل حسین صدیقی کی دریافت تھے۔ چشتی صاحب نے چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ کے پی آر او کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی تھیں۔ ان کی تیار کردہ خبر راولپنڈی / اسلام آباد

میجر جنرل شاہد عزیز فوج سے ریٹائر ہوئے تو نیب کے چیئرمین بھی تعینات کیے گئے، جنرل پرویز مشرف کے آخری ادوار میں ہتھے سے اکھڑ گئے اور ''حق گوئی و بے باکی'' پر اتر آئے

آئی ایس پی آر نے ایک ملزم کی پریس کانفرنس کروادی

اس نے کہا میں صدر غلام اسحاق خان کے داماد کا خاص آدمی ہوں

اس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا

کے صحافتی معیار پر پورا اترتی تھی لہذا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ پاکستان ٹائمز، مسلم، جنگ، نوائے وقت، سمیت دیگر اخبارات میں ان کے عزیز و اقارب، دوست احباب اور شاگردان عزیز کثیر تعداد میں تھے لہٰذا ایک ٹیلی فون ہی کافی تھا اور آئی ایس پی آر کی خبر کو صفحہ اول پر چار چاند لگ جایا کرتے تھے۔ خاص طور پر جنرل مرزا اسلم بیگ کے قومی اور عالمی امور پر فصیح و بلیغ ارشادات عالیہ زبردست کوریج حاصل کرتے تھے۔ خیالات آرمی چیف کے ہوتے تھے لیکن اخباری زبان میں منتقل کرنا چشتی صاحب کا ہی کارنامہ ہوتا تھا۔ جنرل اسلم بیگ بھی آئی ایس پی آر کے کسی اور افسر سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ سے پہلے وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل کے ایم عارف بھی معمول کی عسکری تقریبات میں طویل گفتگو فرماتے تھے۔ ان کی تقاریر کو اخبارات میں شائع کرانا بھی کسی چیلنج سے کم نہیں ہوتا تھا۔ نیوز روم میں موجود ہمارے دوست جلی کٹی سناتے تھے۔ خیر! جنرل آصف نواز نے کمان سنبھالتے ہی ابلاغ عامہ کے سارے معاملات آئی ایس پی آر کی صوابدید پر چھوڑ دیئے۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی اپنی خبر یا تصویر کی مناسب یا غیر مناسب کوریج کے حوالے سے کبھی ڈانٹ ڈپٹ کی ہو۔ البتہ ہم حفظ ماتقدم کے طور پر مناسب کوریج کے انتظامات کرتے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی کراچی سے تبدیل کر کے ملتان تعینات کر دیئے گئے تاہم انہیں جلد ہی راولپنڈی بلا لیا گیا۔ اس وقت آرمی چیف عبدالوحید کاکڑ کے پریس رابطہ افسر کی حیثیت سے میجر شاہد کرمانی فرائض انجام دے رہے تھے۔ میجر شاہد کوئٹہ میں آئی ایس پی آر آفس کے انچارج تھے۔ مجھے امید تھی کہ کراچی میں میری تعیناتی عارضی ہوگی لیکن کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل نصیر اختر نے اصرار کر کے باقاعدہ پوسٹنگ کے احکامات جاری کروا دیئے۔ کچھ عرصہ بعد لیفٹیننٹ جنرل نصیر اختر کو جی ایچ کیو میں تعینات کر دیا گیا اور کراچی کور کی کمان لیفٹیننٹ جنرل لہراسپ خان کے سپرد کر دی گئی۔ ان کی شہرت ایک سخت گیر منتظم اور پیشہ وارانہ امور پر کامل توجہ مرکوز رکھنے والے فرض شناس افسر کی تھی۔

انہوں نے تمام غیر ضروری پروٹوکول اور اسراف وغیرہ سے فوری گریز کے احکامات صادر کیے۔ سب سے اہم فیصلہ آرمی چیف جنرل عبدالوحید کاکڑ کی اجازت سے کراچی شہر سے فوج کی اندرونی سلامتی کی ڈیوٹی سے فراغت تھی۔ یہ فیصلہ دوررس نتائج کا حامل تھا۔ جس کی ہر سطح پر تعریف کی گئی۔ متعدد فارمیشنز کراچی کے گنجان آباد علاقوں میں امن و امان کی بحالی کی ڈیوٹی انجام دے رہی تھیں۔ لیفٹیننٹ جنرل لہراسپ خان نے تمام یونٹس کو کراچی سے نکالا اور ایک آپریشنل نوعیت کی مشق کے لیے سندھ کے صحرا میں لے گئے۔ عسکری مشقیں جاری تھیں البتہ آئی ایس پی آر کا عملہ کراچی

Scanned with CamScanner

ہی میں تھا۔ ایک روز آئی ایس پی آر آفس کو بھی تمام مال واسباب کے ساتھ صحرا میں رپورٹ کرنے کے احکامات مل گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کور کمانڈر کے حکم پر جاری عسکری مشق میں شرکت ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ جنرل اسلم بیگ کے زمانے میں ضرب مومن مشق کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ مشق کے اختتام پر کراچی واپس آئے۔ آرمی یونٹس ملیر چھاؤنی میں مقیم ہوگئیں اور میرے سمیت آئی ایس پی آر کے دیگر اہلکاروں کے چہرے دھوپ اور ریت میں بسر کئے گئے ایام کے باعث سندھی رنگت میں رنگے گئے۔ ادھر آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل جہانگیر نصراللہ کارچور کی پبلسٹی کے واقعہ کے بعد بددِل سے ہوگئے تھے۔ شاید انہوں نے آرمی چیف سے درخواست کی ہوگی۔ ایک روز معلوم ہوا کہ میجر جنرل جہانگیر نصراللہ کور آف انجینئرز میں واپس چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ کور آف سگنلز بریگیڈیئر خالد بشیر کو میجر جنرل کے رینک پر ترقی دے کر ڈی جی آئی ایس پی آر مقرر کر دیا گیا۔ بریگیڈیئر صدیق سالک کی شہادت کے بعد ہم عادی ہوگئے تھے کہ دو تین برس کے بعد ایک نئے ''ٹوسٹار'' کو آئی ایس پی آر سے روشناس کرانا ہے تاکہ وہ اس ادارہ کی سربراہی کا فرض ادا کرسکیں۔ میجر جنرل خالد بشیر شائستہ طبیعت کے حامل پیشہ وارانہ سوچ رکھنے والے ایک سینئر افسر تھے۔ ان کی قیادت میں مجھے ''عوامی جمہوریہ چین'' کی پیپلز لبریشن آرمی کے ''شعبہ تعلقات عامہ'' کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ یہ ایک معلوماتی دورہ تھا تاہم چین سے انتہائی قریبی تعلقات کے باعث معلوماتی کے ساتھ خیرسگالی پہلو زیادہ نمایاں ہوگیا۔ تین رکنی وفد میں میجر (بعد میں بریگیڈیئر ریٹائرڈ) شاہد کرمانی بھی تھے جو آئی ایس پی آر لاہور میں تعینات تھے۔ یوں میجر جنرل خالد بشیر کے ساتھ کراچی اور لاہور میں تعینات آئی ایس پی آر افسر تھے۔ ہمیں مختلف اداروں سے روشناس کرایا گیا۔ ظاہر ہے کہ عوامی جمہوریہ چین میں مختلف نوعیت کا سیاسی نظام رائج ہے۔ اور اس کے تابع صحافت بھی فروغ پذیر ہے۔ چینی افواج کے لیے ابلاغ کا موثر ترین نظام ہے۔ ان کے ہاں عوام سے زیادہ افواج میں خدمات انجام دینے والے افسروں اور دیگر باوردی اہلکاروں کی ابلاغی کیفیت پر توجہ مرکوز ہے۔ ہم عظیم دیوار چین پر ''چہل قدمی'' کر رہے تھے کہ کسی نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ پی ایل اے (پیپلز لبریشن آرمی) کے شعبہ تعلقات عامہ کے سربراہ ٹوسٹار جنرل تھے۔ مجھے کہنے لگے کہ یاد رکھو کامیابی کے لیے افواج سے منسلک تمام افراد میں یکسوئی ضروری ہے۔ میرے اپنے فوجیوں کے لیے ''آرمی ڈیلی'' تیار کرتا ہوں جو وہ کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ''پیپلز ڈیلی'' سے پہلے پڑھ لیتے ہیں۔ یوں میری ڈیوٹی مکمل ہوگئی۔ دشمن سب سے پہلے من گھڑت خبر وغیرہ کے ذریعے فوج میں بددلی پھیلاتا ہے۔ اس پر نظر رکھنی چاہیے۔ میں دیوار چین پر کھڑا

''بھٹو ملٹری الائنس'' سے وطن عزیز کو
ناقابل تلافی نقصان پہنچا، بدقسمتی سے سانحہ 71ء
کے بعد بھی ''بھٹو ملٹری الائنس'' برقرار رہا

Scanned with CamScanner

جنرل یحییٰ خان اور بھٹو کو شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ بند کر دیا جاتا تو سقوط ڈھاکہ جیسے سانحہ سے بچا جا سکتا تھا

چینی جنرل کی گفتگو توجہ سے سن رہا تھا جو اپنے تئیں دشمن کے بیانیے کے آگے روزانہ ایک نئی دیوار تعمیر کرنے کا عزم رکھے ہوئے تھے۔ ہم واپس آ گئے۔ خفیہ رپورٹس ارسال کی گئیں اور ہم نے ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل خالد بشیر کو بھی ''عسکری میڈیا'' کے قیام کی کوششوں پر راضی کر لیا تھا۔ بریفنگز کا دور چلا، تخمینے لگائے گئے کہ کم از کم ایک روزنامہ اخبار افواج کے لیے تیار کیا جائے۔ خاص طور پر اگلے مورچوں پر خدمات انجام دینے والے صورتحال سے بھرپور آگاہی حاصل کر سکیں۔ بہرحال یہ منصوبہ ابتدائی گرم جوشی کے بعد طویل سرد مہری کا شکار ہو گیا۔

جنرل عبدالوحید کاکڑ کی مدت کمانڈ مکمل ہونے کے بعد لیفٹیننٹ جنرل جہانگیر کرامت کو ترقی دے کر جنرل کے رینک میں چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا گیا۔ ان کا تعلق آرمرڈ کور سے تھا۔ آئی ایس پی آر کے ڈی جی میجر جنرل خالد بشیر کے بعد میجر جنرل سلیم اللہ خان تعینات کیے گئے۔ ان کا تعلق انفینٹری رجمنٹ سے تھا۔ میجر جنرل سلیم اللہ نے مختلف شہروں کے صحافیوں سے قریبی تعلقات استوار کر لیے۔ آئی ایس پی آر سے قبل میجر جنرل سلیم اللہ ایک حساس ادارے کے ساتھ منسلک رہے تھے۔ یوں انہیں سرکردہ صحافتی شخصیات کے پس منظر سے بخوبی آگاہی تھی۔ کبھی کبھار ہم ''مستقل'' آئی ایس پی آر والے بھی ڈی جی سے گفتگو کے دوران اکثر زیر ہو جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے دور میں پاک افواج کے ترجمان ہفت روزہ ہلال (آج کل ماہنامہ ہلال) کو روزنامہ میں تبدیل کرنے کے لیے کافی ہوم ورک کیا۔ میں نے اس ضمن میں مکمل بریفنگ دی۔ لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی کو مدیر بنانے پر اتفاق تھا لیکن آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت نے آخری مرحلے پر تجویز پر عمل درآمد موخر کر دیا۔ میں ابھی کراچی آفس ہی میں تعینات تھا۔ معمول کے فرائض جاری تھے۔ ایک روز میجر جنرل سلیم اللہ نے فون پر دریافت کیا کہ پاک افواج کا ایک دستہ یوگوسلاویہ میں امن دستے کے طور پر یو این ڈیوٹی انجام دینے جا رہا ہے کیا تم دلچسپی رکھتے ہو؟ میں نے فون ہی پر رضامندی کا اظہار کر دیا، یوں چند ہفتے بعد لاہور سے پاک افواج کے ایک دستے کے ساتھ کروشیا کے صدر مقام زغرب روانہ ہو گیا۔ اس دستے میں انفینٹری (11 بلوچ رجمنٹ) آرمرڈ کور کا سکارڈن، آرٹلری کی بیٹری کے علاوہ انجینئرز، سگنلز اور میڈیکل کور کی نمائندگی بھی تھی۔ ہم اپریل 1996ء سے اگست 1997ء تک کروشیا اور سربیا کے مابین متنازع علاقے برانیہ میں امن و امان کی ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔ پاک فوج کے دستے کی قیادت بلوچ رجمنٹ کے کرنل (بعد میں بریگیڈیئر ریٹائرڈ) کر رہے تھے۔ ہم سے قبل بلجیم کی فوج کا دستہ اس علاقے میں تعینات تھا۔ مشرقی یورپ کا یہ خطہ بدستور جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ ایک

بہت بڑی مملکت یوگوسلاویہ کو منصوبہ بندی کے تحت چھ ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پاک افواج کا دستہ جس علاقے میں پہنچا وہاں سربیا کے حامیوں کی اکثریت تھی۔ یہ وفاق کے حامی تھے اور یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے پر سخت دل گرفتہ تھے۔ اس علاقے کے باشندے ''آرتھوڈوکس کرسچن'' مذہب کے ماننے والے تھے۔ پاکستان کے فوجی ان کے نزدیک ''ناپسندیدہ'' تھے۔ بہرحال انتہائی نامساعد حالات میں پیشہ وارانہ فرائض کی ادائیگی کا آغاز ہوا۔ ایک شب افسر رہائشی بلڈنگ میں عشائیہ کے لیے جمع ہو رہے تھے کہ باہر سے پتھر برسنا شروع ہو گئے۔ خیر یہ سلسلہ جلد ہی رک گیا اور ہماری جانب سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اگلے روز کمانڈر نے میڈیکل ٹیم کو ہدایت کی کہ وہ ہاتھوں میں ادویات اور ڈاکٹر سٹیتھوسکوپ نمایاں کیے ''سوشل پیٹرولنگ'' شروع کریں۔ اقوام متحدہ کی جانب سے مہیا کیے گئے ترجمان ہمراہ تھے۔ آئی ایس پی آر کی ٹیم بھی ساتھ تھی۔ مقامی ناراض شہریوں کے لیے یہ ایک منفرد نظارہ تھا۔ کچھ نے نعرے بلند کیے تاہم اس بہانے قصبہ کے گلی کوچوں میں ہماری رسائی ممکن ہو گئی۔ آہستہ آہستہ مریض پاک آرمی کے میڈیکل سنٹر آنا شروع ہو گئے۔ زیادہ تر بوڑھے مرد، خواتین اور بچے تھے۔ نوجوان جنگی سرگرمیوں میں مصروف تھے یا مخالفین کے ہاتھوں مارے جانے کے خوف سے ''گمشدہ'' ہو گئے تھے۔ میں نے مقامی صحافیوں سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تو سخت مزاحمت کا سامنا ہوا۔ پاکستان کے بارے میں ان کے خیالات میں منفی عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ یہ صحافی زیادہ تر ''سربین'' تھے، روس نواز تھے یا سمجھ لیجیے کہ مارشل ٹیٹو کے فلسفے کے حامی اور بلغراد حکومت کے تابع سمجھے جاتے تھے۔ اب یہ علاقہ متنازع تھا اور یہ فیصلہ ہونا تھا کہ اسے کیتھولک اکثریت کے ملک کروشیا میں شامل کیا جائے یا سربیا میں رہنے دیا جائے۔ دراصل مارشل ٹیٹو کے انتقال کے بعد یوگوسلاویہ میں مذہبی، علاقائی اور نسلی تضادات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ میڈیا نے بھی اس سلسلے میں منفی کردار ادا کیا اور ہر علاقے میں موجود لاتعداد ٹی وی، ایف ایم ریڈیو اور اخبارات نے تضادات کو مزید ہوا دی۔ مغربی دنیا پہلے ہی تاک میں تھی، انہیں یورپ میں طاقتور ترین سوشلسٹ ملک کو جمہوریت کے نام پر تہہ و بالا کرنے کا بہترین موقع میسر آ گیا۔ سیاسی دھڑے بندیوں میں تشدد کا عنصر نمایاں ہوا تو مسلح جتھے وجود میں آ گئے۔ کیتھولک کروئٹ کی زیادہ تر جرمن میں مقیم کروئٹ باشندے مدد کرتے رہے۔ آرتھوڈکس کرسچن وفاق کی پناہ میں تھے اور ان کا موقف یہ تھا کہ دیگر علاقوں میں شورش پسند باغی ہیں اور ان کے خلاف فوجی کارروائی ہونی چاہیے۔ بوسنیا کی مسلم آبادی کا علیحدہ تشخص ہے۔ انہوں نے پہلے سرب اور کروئٹ دونوں کی جانب سے روا رکھے گئے مظالم کا سامنا کیا۔ کچھ عرصے بعد مسلمانوں نے

نواز شریف، جنرل پرویز مشرف اور جنرل ضیاء الدین کو اڈیالہ جیل میں ایک ساتھ بند کر دیا جاتا تو ربع صدی تک وطن عزیز میں سیاسی استحکام رہتا

Scanned with CamScanner

پاک افواج کو بھٹو صاحب کی

''انتخابی فتح'' کا راستہ ہموار کرنے کے لئے

بھاری قیمت چکانا پڑی

اپنی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ ہم سے پہلے بھی پاک افواج کے متعدد دستے اقوام متحدہ کے پرچم تلے شورش زدہ علاقوں میں قابل تعریف خدمات انجام دے چکے تھے۔ ہمارا دستہ بوسنیا کے صدر مقام سرائیوو سے تقریباً تین سو کلومیٹر فاصلے پر مورچہ زن تھا۔ یوگوسلاویہ میں قیام کے دوران تین مرتبہ سرائیوو جانے کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ ذاتی حیثیت میں اور دوبار دورہ سرکاری نوعیت کا تھا۔ ہماری وردی پر اقوام متحدہ کے نشان کے ساتھ پاکستان کا پرچم بھی آویزاں تھا۔ بوسنیا کے حدود شروع ہوتے ہی مرد و زن اور بچے جونہی پاکستان کا پرچم دیکھتے تو اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کرتے۔ ہم چند افسر ایک کرافٹ کے ذریعے دریا عبور کر رہے تھے کہ اچانک دریا کی لہروں سے اللہ اکبر اور پاکستان پاکستان جیوے پاکستان کی آوازیں سنائی دیں۔ غور سے دیکھا تو چند بچے اور جوان نعرے بلند کرتے دکھائی دیئے۔ دریا میں ڈبکی لگا رہے تھے۔ کنارے پر اترے تو کچھ عمر رسیدہ افراد بیٹھے تھے۔ ہم جونہی قریب ہوئے تو انہوں نے ہمارے ہاتھ چومنا شروع کر دیئے۔ پاکستان آرمی، پاکستان آرمی پکارتے ہوئے وکٹری کا نشان بلند کرتے۔ یہ سب کچھ ہم سے پہلے خدمات انجام دینے والے پاک فوج کے امن دستے کی بدولت تھا جنہوں نے بے لوث انداز میں ملی جذبے کو سربلند رکھتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیئے اور پورے علاقے کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ پاک فوج کے افسر اور جوان ماہ رمضان میں باقاعدگی سے روزے رکھ رہے تھے تو اقوام متحدہ کی جانب سے ملنے والا راشن اور دیگر اشیائے خورونوش کافی مقدار میں بچ جایا کرتا تھا۔ بعد ازاں راشن پیکٹ جنگ سے متاثرہ خاندانوں میں تقسیم کرتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پاک فوج کی بدولت بوسنیا کے مسلمانوں کو امید اور کامیابی کی ایک نوید ملی۔ ایک مرتبہ بوسنیا کے ''مسٹر جناح'' جناب عزت بیگووچ سے ملاقات بھی ہوئی۔ انہوں نے پاکستان کی امداد اور پاک فوج کی خدمات کا اعتراف انتہائی جذباتی انداز میں کیا۔

سرائیوو شہر عظیم تاریخی ورثے کا حامل ہے۔ رہن سہن اور ظاہری شناخت کے لحاظ سے یورپ کا شہر ہی دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے رگ و پے میں مسلم قومیت اور ترک ثقافت رواں دواں ہے۔ سٹی سنٹر میں کھڑے تھے کہ مغرب کی اذان سنائی دی۔ قریب ہی جامع مسجد کی جانب مرد و عورتیں ایک ساتھ رواں دواں تھے۔ یہ منظر ہمارے لیے غیر مانوس تھا۔ اکثر جوان خواتین مغربی لباس زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ ان کی منزل بھی جامع مسجد تھی۔ ہم مسجد پہنچے تو دیکھا کہ خواتین کے لئے علیحدہ انتظامات ہیں جہاں وہ گاؤن اوڑھ کر نماز کے لیے تیار ہو جاتی ہیں اور ان کی صف مردانہ صف کے پیچھے تھی۔ امام صاحب نے نماز مغرب کے بعد دعا کے لئے ہاتھ

Scanned with CamScanner

بلند کیے اور رقت آمیز انداز میں دعائیہ کلمات پڑھنے لگے۔ شاید ان کی نظر میں ہم بھی تھے۔ یو این آرمی کی وردی اور اس پر پاکستان کا پرچم سجائے ہم بھی سربسجود تھے۔ انہوں نے دعا میں خاص طور سے پاکستان کی سلامتی اور کشمیر کی آزادی کا بھی ذکر کیا۔ یوں جب تک بوسنیا کی حدود میں رہے بازار، کیفے، مساجد، دفاتر اور پارکس وغیرہ میں جہاں کہیں عوام ہمیں دیکھتے تو ''پاکستان۔ پاکستان'' کی صدائیں بلند کرتے تھے۔

ہم جس علاقے میں مورچہ زن تھے وہ سربیا سے جڑا ہوا تھا اور کروشیا سے بھی جغرافیائی رابطہ تھا۔ مارشل ٹیٹو کے دورِ حکومت میں بین المذہبی شادیاں عام تھیں، مسیحیوں کے فرقے ہوں یا مسلمان آپس میں شادی کی سرکاری طور پر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ہمارے علاقے میں کئی ایسے خاندان تھے جنہیں لڑائی کے باعث منتشر ہونا پڑا۔ یعنی شوہر سرب بیوی بچوں کو چھوڑ کر کروشیاء کی ''مذہبی'' فوج میں شامل ہوگیا۔ حالات معمول پر آئے تو پاک فوج کے زیرِ انتظام علاقے میں منتشر خاندانوں کی ری یونین کے لیے ہفتہ وار انتظامات کیے گئے۔ ماں بیٹی، شوہر بیوی اور معمر افراد کی باہمی ملاقات کے مناظر انتہائی رقت آمیز تھے۔ بظاہر جب ملک ٹوٹتا ہے تو عام شہریوں کو بے شمار سماجی، معاشی اور خاندانی مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر سرب اور کروئٹ صحافی بھی آپس میں ملاقات کے لیے درخواست دیا کرتے تھے۔ میں نے اس صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور دونوں جانب کے صحافیوں سے میل جول بڑھانے کے ساتھ اخبارات اور ایف ایم ریڈیوز کے ذریعے پاکستان کے بارے میں عمومی معلومات کی خوب تشہیر کی۔ ایک مرتبہ سرب ٹی وی کے ذریعے یوم پاکستان کے بارے میں فلم ٹیلی کاسٹ کرادی۔ اس میں کشمیر کا بھی ذکر تھا۔ سربیا میں موجود بھارتی سفارت کاروں نے اظہار برہمی کرتے ہوئے اقوام متحدہ کے مقامی دفتر کو احتجاج نوٹ کرایا تاہم سرب ٹی وی کا نگران اس بات سے انکاری ہوگیا کہ یہ فلم ہمیں پاک فوج کے پریس رابطہ افسر نے مہیا کی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ سرب فوج، میڈیا اور سیاسی رہنماؤں کا کرب سقوط مشرقی پاکستان کے سانحہ سے ملتا جلتا ہے۔ لہذا میں نے اسی بنیاد پر ان سے راہ و رسم بڑھائی۔ آغاز میں اکثر نالاں تھے تاہم جب ''وفاق'' کی عظمت اور سربلندی کے لیے جاری جنگ میں یکساں کردار نمایاں کیا تو دوستی کی راہ ہموار ہوگئی۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر سے زیادہ بے تکلفی ہوگئی۔ موصوف سرب تھے اور وفاق کے حامی تھے۔ متحدہ یوگوسلاویہ کے لیے زور قلم صرف کررہے تھے۔ امریکہ نے اقوام متحدہ کے ذریعے یورپ کے مضبوط ترین سوشلسٹ ممالک کو پارہ پارہ کردیا تھا۔ سانحہ مشرقی پاکستان کا ذکر آیا تو بھارت کی زبان بولنے لگے۔ میں نے بتایا کہ اسلام آباد بھی بلغراد کی مانند وفاق کی علامت ہے۔

جنرل ٹکا خان کی ریٹائرمنٹ قریب تھی اور

ذوالفقار علی بھٹو کو ایک اور

جنرل ٹکا خان کی تلاش تھی

Scanned with CamScanner

جنرل ٹکا خان نے مشرقی پاکستان میں بھٹو صاحب کے ''سیاسی عزم'' کی ''عسکری انداز'' میں تکمیل کی

بھارت نے لسانی اور جغرافیائی پہلوؤں کو بھرپور انداز میں استعمال کرتے ہوئے پہلے شورش کو ہوا دی اور اس کے بعد اپنی افواج کے ذریعے عسکری برتری حاصل کرلی۔ ہماری افواج وفاق کی علامت تھیں جسے بلغراد یوگوسلاویہ کے وفاق کو بچانے کے لیے عسکری حکمت عملی پر کار بند تھا لیکن بین الاقوامی سازش کے تحت اسے شکست دی گئی۔ یہ بیانیہ ان کے ذہن میں پیوست ہوگیا۔ اب اسلام آباد اور بلغراد ان کی نظر میں ''جڑواں بھائی'' تھے۔ چلتے چلتے میں نے ازراہ تفنن باور کروایا کہ متحدہ یوگوسلاویہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے والے پہلے دو تین ملکوں میں شامل تھا۔ یہ دسمبر 1971ء کا ذکر ہے اور آج (1996ء) میں پچیس برس بعد پاکستان کی فوج یوگوسلاویہ کے حصے بخرے کرنے میں مصروف ہے۔ ان کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔ کہنے لگے کہ مارشل ٹیٹو واقعی بھارت کے بہت قریب بلکہ تابع تھا۔ سرب صحافی کافی حد تک ہمارے ''ہمنوا'' ہوگئے تھے۔ البتہ انہیں ایک شکایت رہی۔ دراصل پاک فوج کے زیر انتظام علاقے ''برانیہ'' کی سرخ شراب ذائقے اور دوررس اثرات کے باعث بے حد مقبول تھی۔ یہ مشروب ہی ''کشیدگی'' کا سبب تھا۔ کچھ عرصے بعد انہیں یقین ہوگیا کہ پاک فوج کے پی آر او کی رسائی صرف دودھ پتی تک محدود ہے۔ سرخ شراب کے تحفے کی توقع وقت کا ضیاع ہوگا۔ علاقے میں حد نظر تک انگور کے باغات تھے۔ دودھ اور شہد کی ''سوشلسٹ'' انداز میں فارمنگ تھی۔ جنگ سے پہلے لوگ ہشاش بشاش اور معاشی لحاظ سے مطمئن تھے کہ اچانک بلغراد اور زغرب سے اٹھنے والے سیاسی طوفان نے جس کی بنیاد مذہبی عصبیت تھی سب کچھ تہہ بالا کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گلی محلے اور شہر میدان جنگ میں تبدیل ہوگئے۔ پادری مسلح جتھے ترتیب دینے لگے۔ کروشیاء میں مسلم املاک کو بہت نقصان پہنچا۔ مرد شہید کیے گئے، عورتیں بڑی تعداد میں اغواء کرلی گئیں۔ بچے لاپتہ ہوگئے۔ سابق یوگوسلاویہ میں باہمی لڑائی جھگڑے اور جنگ و جدل کے دوران انسانیت سوز مظالم کا بازار گرم رہا۔ اس بارے میں بہت کچھ شائع ہو چکا ہے۔ ہمارے زیر انتظام علاقے کے قریب ہی کروشیاء کا ایک خوبصورت قصبہ ''اوسیک'' تھا جہاں ہم کبھی کبھار جمعہ کی نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ اکثر اپنے ہیڈکوارٹرز ہی میں افسر اور جوان پنجگانہ نماز ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دو تین افسروں کے ہمراہ ''اوسیک'' گئے جہاں ایک مسلمان نے اپنے گھر کے ایک کمرہ میں نماز کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مارشل ٹیٹو کی حکومت قائم ہونے سے پہلے ''اوسیک'' میں دس سے زائد مساجد تھیں۔ ترکی کمزور ہوا۔ فوج بکھر گئی تو مسلمانوں پر بھی عرصہ حیات تنگ ہوگیا۔ سویت یونین کی مانند یوگوسلاویہ میں بھی فوٹو سیشن کے لئے چند مساجد برقرار رکھی گئی تھیں۔ کروشیاء کے علاقے میں مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ تبدیلی مذہب کا رجحان بھی چل

Scanned with CamScanner

نکلا، اکثر لاذہب ہو گئے۔ خیر! نماز جمعہ کے بعد امام صاحب نے اقامت گاہ ہی میں کافی پر مدعو کیا اور مسجد کے بارے میں گفتگو شروع کی۔ ان کا خیال تھا کہ مالی امداد کے بغیر مسجد کی بحالی ممکن نہیں۔ مالک مکان کی بیٹی جو انگلش سمجھتی تھی ترجمانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اس نے امام صاحب کی بات کا ترجمہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ آپ مسجد کی انتظامیہ کو چندہ نہ دیں۔ ہم مسلمان نوجوانوں کے لیے ویک اینڈ کلب نہیں ہے جس کی وجہ سے بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ امام صاحب نے مسکراتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن ''اوسیک'' کی مسلمان طالبہ نے معذرت کر کے بات جاری رکھی۔ اس نے کہا کہ دو ہفتے قبل میرے باپ نے اپنی بہن کا رشتہ ایک غیر مسلم نوجوان سے کر دیا ہے۔ کیونکہ مسلمان لڑکے لاپتہ ہیں۔ کچھ بوسنیا چلے گئے، چند ایک کروشیاء میں ہیں لیکن اپنی شناخت ظاہر نہیں کرتے۔ اگر ہمارا ایک ویک اینڈ کلب قائم نہ ہوا تو میرے والد مجھے بھی کسی غیر مسلم نوجوان کے حوالے کر دیں گے۔ میں ہر ''ویک اینڈ'' گھر پر ہی گزار رہی ہوں۔ دوسری طرف میری کیتھولک دوست اپنے کلب میں جاتی ہیں۔ ان کی شادیاں ہو رہی ہیں۔ بچی نے توقف کیا تو امام صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اب طالبہ نے اپنی زبان میں امام صاحب کو خلاصہ بیان کیا۔ جس پر ان کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے تاہم سر کے اشارے سے تسلیم کا اظہار کرتے رہے۔ قصہ مختصر! میرے ساتھ گئے افسر گومگو کی کیفیت میں تھے۔ مسجد کے لیے پیسے لائے تھے۔ اب مسلم نوجوانوں کے لیے ''ویک اینڈ کلب'' کا مطالبہ سامنے تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ جگہ کہاں قائم ہو سکتی ہے؟ تو طالبہ نے کہا کہ جس مکان میں آپ نے نماز پڑھی ہے۔ اس مکان کی بیس منٹ موجود ہے جہاں لکڑی کا فرش ہے جو ڈانس کے لیے بہت موزوں ہوگا۔ بارش کی وجہ سے مٹی جم گئی ہے۔ اگر یہ مٹی ہٹا دی جائے اور میوزک سسٹم لگ جائے تو مسلم نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ویک اینڈ کلب بن سکتا ہے۔ یوں ہم آپس میں ملیں گے اور شادی بھی کر سکتے ہیں۔ نوجوان طالبہ نے گلوگیر آواز میں بات ختم کر دی۔ ہم پاکستانی سکتے کے عالم میں تھے۔ ہنس مکھ میجر خٹک نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اردو میں کہا کہ سر! آپ رینک میں سینئر ضرور ہیں لیکن یہ معاملہ عسکری نوعیت کا نہیں ہے، اس کے باوجود فیصلہ آپ نے ہی کرنا ہے کیونکہ آپ سید ہیں۔ قیامت کے دن آپ ہی جوابدہ ہوں گے۔ میجر خٹک کی بات ختم ہوتے ہی میں نے مالک مکان سے درخواست کی کہ ہمیں مکان کی بیس منٹ دکھائے تاکہ فیصلہ کر سکیں۔ یہ مسجد کے لیے مختص کمرے کے نیچے ہی خاصی بڑی جگہ تھی جسے صفائی کے بعد مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ بہرحال پہلے ویک اینڈ کلب کی تشکیل کے لیے مناسب رقم مہیا کر دی گئی

جنرل آصف نواز نے آرمی چیف کا منصب سنبھالا اور اپنے مختصر خطاب میں کہا: ''ہمیں صرف ایک سپاہی بن کر رہنا ہے، کسی اور کردار کی کوئی گنجائش نہیں''

Scanned with CamScanner

دن کو جرنیل جاگتے تھے اور رات کو صحافی

میں نوکری کی وجہ سے ان دونوں

کے ساتھ جاگتا

تاکہ مسلم نوجوانوں کے ''عائلی'' بحران پر قابو پایا جا سکے۔ دو ہفتے بعد ہم دوبارہ ''اوسیک'' گئے تو شہر کی واحد مسجد جو ایک کمرہ پر مشتمل تھی کے نیچے ویک اینڈ کلب قائم ہو چکا تھا جہاں ہفتہ اور اتوار کو شہر کے مسلمان لڑکے اور لڑکیاں جمع ہو کر ڈانس وغیرہ کرتے تھے۔ یوں ان کے مابین میل جول بڑھنے لگا۔ کئی دہائیوں سے یوگوسلاویہ کی سماجی روایات میں شادی سے پہلے فرینڈ شپ کا عمل ضروری تھا۔ یہ تمام فرقوں میں رائج تھا۔ مسلمان ابتداء میں ہچکچاتے رہے تاہم خلافت عثمانیہ کے خاتمے اور مسلم سماج کے زوال کے بعد وہ بھی علاقائی رسومات اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

پاک فوج کے یو این مشن دستے کا ہیڈ کوارٹر ''داردا'' قصبے کے قریب واقع تھا۔ اس کے ساتھ ہی فٹ بال گراؤنڈ تھی جسے چاروں جانب سے باڑ لگا کر محفوظ بنایا گیا تھا۔ جنگ کے دوران بھی یہ جگہ سپورٹس تقریبات کے لیے استعمال ہوتی رہی۔ ہمارے دستے کو پہنچے ابھی چند روز ہی گزرے ہوں گے کہ قصبے کے میئر نے کمانڈر بریگیڈیئر طارق رسول سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میئر سرب قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ہمراہ وفد بھی تھا۔ ملاقات کے دوران انہوں نے درخواست کی کہ پاکستان آرمی کے افسران اور جوان فٹ بال گراؤنڈ میں صرف سپورٹس شو پہن کر داخل ہوں کیونکہ بڑے بوٹوں سے گھاس کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ گراؤنڈ ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے لیے مخصوص ہے۔ غیر متعلقہ شہری داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہی میچ دیکھتے ہیں۔ ہم نے قیام کے دوران دیکھا کہ عمر کے لحاظ سے تین مختلف ٹیمیں تھیں جو مختلف اوقات میں باقاعدگی سے پریکٹس کرتی تھیں۔ سب سے پہلے چھوٹے بچے آتے تھے۔ جنہیں چکس کہا جاتا تھا۔ یہ کھیلتے کم اور شور زیادہ کرتے تھے۔ ایک مستعد کوچ مسلسل ان کی نگرانی پر مامور تھا۔ ان کے بعد لڑکے لڑکیاں گراؤنڈ میں فٹ بال کے پیچھے بھاگتے دکھائی دیتے۔ سب سے آخر میں باقاعدہ ٹیم کے کھلاڑی گراؤنڈ میں پیشہ وارانہ کھلاڑی کی مانند پریکٹس کرتے نظر آتے تھے۔ ہفتے، پندرہ روز میں باقاعدہ میچ بھی ہوتا تھا۔ فٹ بال کے متعدد کوچ بھی گراؤنڈ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تھے۔ جنگ نے ان کی مصروفیات ختم کر دی تھیں۔ انہیں ملازمت کی ضرورت تھی۔ پاکستان اطلاع بھجوائی گئی کہ سستے داموں فٹ بال کے بہترین کوچ دستیاب ہیں۔ کافی انتظار کے بعد جواب آیا کہ ''تمہیں جس کام کے لیے بھیجا گیا ہے اس پر توجہ دو۔ فٹ بال کے فروغ کے لیے فٹ بال فیڈریشن پاکستان موجود ہے''۔ بہرحال ہم نے علاقے میں پاکستان ساختہ فٹ بال تقسیم کیے۔ یہ سرب کھلاڑیوں کے لیے ایک بہترین تحفہ تھا۔ یوں ''تعلقات عامہ'' مزید خوشگوار ہو گئے۔

سابق یوگوسلاویہ میں گزرے شب و روز میری

زندگی کا ایک منفرد تجربہ تھا۔ سب سے اہم پہلو پاک فوج کی بے مثال پیشہ وارانہ صلاحیت، اہلیت اور فرض سے لگاؤ کا بین الاقوامی سطح پر اعتراف تھا۔ یو این مشن کے سربراہ امریکی تھے جبکہ تیس سے زائد ممالک پر مشتمل یو این آرمی کی قیادت بیلجیم فوج کے میجر جنرل شکوپس کر رہے تھے۔ یہ دونوں اعلیٰ شخصیات ہمیشہ پاک فوج کی خدمات کا برملا اعتراف کرتے اور دیگر ممالک کی افواج کے سامنے بھی پاک فوج کے دستے کو ''مثالی'' قرار دیتے تھے۔ واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جنہیں ایک نشست میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ آج کل ''جزوی'' فرصت کے ایام میں سابق یوگوسلاویہ کے عروج و زوال اور پاک افواج کے ساتھ بسر کیے گئے شب و روز پر مبنی یادداشتیں مرتب کر رہا ہوں۔ یہاں قیام کے دوران سرکاری تعطیلات کی بدولت مشرقی یورپ کے دیگر ممالک کے علاوہ جرمنی، بیلجیم، ہالینڈ اور برطانیہ کی سیر کے مواقع بھی میسر آئے۔ سابق یوگوسلاویہ سے واپسی کے لیے ہمیں کروشیاء کے صدر مقام زغرب سے روانہ ہونا تھا۔ یہ شہر ایک زمانے میں یوگوسلاویہ کا حصہ تھا۔ یہ بات مشاہدے میں آئی کہ طاقت ور ممالک ہمیشہ اپنے مخالف ملکوں میں نسلی قومیت، مقامی اشتراکیت، مغربی جمہوریت، فقہی مملوکیت اور عسکری آمریت کے بل بوتے پر عوام کو بیوقوف بناتے ہیں۔ سب سے پہلے سیاسی قیادت میں باہمی سر پھٹول کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد فوج کو کمزور کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابلاغ کے ذرائع بھی سیاسی قیادت بشمول حکمرانوں کے آلہ کار بن کر بیرونی بیانیہ کو مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اس صورتحال میں بڑے سے بڑا ملک بھی لڑکھڑا جاتا ہے۔

سابق یوگوسلاویہ امن مشن کے ساتھ خدمات انجام دینے کے بعد واپس آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ راولپنڈی میں تعیناتی کر دی گئی۔ جنرل جہانگیر کرامت کے بعد جنرل پرویز مشرف چیف آف آرمی سٹاف مقرر کر دیئے گئے تھے۔ لائن آف کنٹرول، ورکنگ باؤنڈری اور سیاچن کے علاقے میں کشیدہ صورتحال پر خاص نظر رہتی تھی۔ جی ایچ کیو میں بریفنگ وغیرہ کا زور تھا۔ ایک دو مرتبہ وزیراعظم میاں نواز شریف بھی تشریف لائے۔ بعد ازاں کارگل کا محاذ کھل گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ابھی ابتدائی اطلاعات آ رہی تھیں۔ آئی ایس پی آر کے سربراہ بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل ریٹائرڈ) راشد قریشی نے مجھے حکم دیا کہ فوری طور پر آئی ایس پی آر کی ٹیم ایک افسر کی نگرانی میں سکردو بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز میں رپورٹ کرے۔ ٹیم تیار ہوگئی۔ اب سینئر صحافیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ اگلے مورچوں کا دورہ تھا۔ ان میں بی بی سی، وائس آف امریکہ، وائس آف جرمنی وغیرہ کے نمائندے بھی تھے۔ ہم ہیلی کاپٹر کے ذریعے سکردو پہنچے۔ اندھیرا پھیلتے ہی دریا کے ساتھ ساتھ ہمارا قافلہ آگے روانہ ہوگیا۔ آرمی جیپوں میں

آرمی چیف جنرل آصف نواز کے ساتھ
''پریس رابطہ افسر'' کی نوکری
دو دھاری تلوار کے مترادف تھی

Scanned with CamScanner

جنرل ضیاء الحق کی قومی خدمات کو محض ''مارشل لاء حکمران'' کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

سینئر صحافی سوار تھے۔ سب سے آگے میری جیپ تھی۔ شنید تھی کہ یہ راستہ بھارتی توپوں کی زد میں ہے لہٰذا لائٹس آن کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جیپ کے آگے ایک جوان سفید قمیض پہنے تیز قدموں کے ساتھ چل رہا تھا تاکہ جیپ ڈرائیور کا اندازہ درست رہے۔ سفر کئی گھنٹوں پر محیط تھا۔ دو تین مرتبہ چند منٹ کے لیے رکے تاکہ قافلے کی ترتیب بگڑنے نہ پائے۔ نصف شب سے کچھ زیادہ وقت ہو گیا تھا کہ ایک پہاڑی کے دامن میں پڑاؤ کیا۔ گرم چائے کا دور چلا۔ مقامی کمانڈر نے عسکری صورتحال پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے نقشے پر موجود نشانات کی مدد سے وضاحت کے ساتھ سوالات کے جواب بھی دیئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صبح تفصیلی بریفنگ ہو گی۔ اس دوران بھارتی فوج کی آرٹلری گولہ باری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ قریب ہی پاک فوج کی توپیں نصب تھیں۔ انہوں نے بھی جوابی کارروائی شروع کر دی۔ اب محفوظ پناہ گاہ پہاڑ کے قرب و جوار میں موجود بڑے بڑے پتھر ہی تھے۔ دن نکلا تو جنگی طیاروں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔ سر اٹھاتے تھے تو بلند و بالا پہاڑوں کا وسیع سلسلہ تھا۔ صورتحال واضح نہیں تھی۔ ادھر صحافیوں کے تذبذب کا سامنا بھی آسان نہیں تھا۔ میرے اصرار پر بریفنگ کا وقت پہلے کر دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ دو بھارتی لڑاکا طیارے گرا دیئے گئے ہیں۔ ایک پائلٹ مارا گیا جبکہ دوسرا گرفتار کیا گیا اور باقی باتیں جہازوں کے بچے کھچے کباڑ پر ہوں گی۔ کچھ دیر بعد ہم موقع پر موجود تھے۔ بھارتی لڑاکا طیارے کی دُم تمام نشانات کے ساتھ جارحیت کے ثبوت کے طور پر نمایاں تھی۔ اور بھی پرزے بکھرے ہوئے تھے۔ بھارتی سکواڈرن لیڈر ہلاک تھا جبکہ فلائٹ لیفٹیننٹ نے جہاز ہٹ ہوتے ہی پیراشوٹ سے کودنے میں عافیت سمجھی اور اسے برسر پیکار مجاہدین نے گرفتار کر کے پاک فوج کے حوالے کر دیا تھا۔ گرائے گئے بھارتی لڑاکا طیارے کی دم کے ساتھ صحافیوں نے جی بھر کر فوٹو گرافی کی۔ ٹی وی کے لیے مووی بھی بنائی گئیں۔ یوں یہ سب کچھ چند لمحوں کے بعد دنیا بھر میں نشر ہو گیا۔

اب جنگ کارگل ایک عالمی خبر بن گئی اور دنیا بھر کا میڈیا اس جانب متوجہ ہو گیا۔ کشمیر ایک بار پھر خبروں میں تھا اور تجزیہ نگار جاری جنگ کا تعلق بھی 1947ء کے تقسیم ہند فارمولے سے جوڑ رہے تھے۔ ہم نے ایک رات مزید اگلے مورچوں پر پاک فوج کی مہمان نوازی کا لطف اٹھایا۔ جنگ کارگل کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ چند ایک عسکری فیصلے ہیں اور کچھ سیاسی عوامل کی ترجیحات و توضیحات وغیرہ۔ جنگ کسی طور اپنے اختتام کو پہنچی تو تجزیے شروع ہو گئے۔ وزیراعظم نواز شریف سے منسوب یہ بیانیہ عام کیا جانے لگا کہ معرکہ کارگل ان کی اجازت کے بغیر شروع کیا گیا تھا۔ اب دونوں جانب سے دلائل اور واقعات کے انبار لگنا شروع ہو گئے۔ یہ ''راج نیتی'' کے حوالے سے ایک تشویش

Scanned with CamScanner

ناک بات ہے۔اول تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وزیراعظم کی مرضی کے بغیر اس قسم کی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی تھی۔اس زمانے کی ہائی کمان میں یہ تاثر عام تھا کہ نواز شریف عسکری معاملات اور خاص طور سے بھارت سے نبرد آزمائی کی تاریخ سے مکمل آشنائی کا تاثر نہیں دیتے تھے۔انہیں سطحی اور سرسری گفتگو زیادہ مرغوب ہے۔جنرل پرویز مشرف کے علاوہ بھی متعدد سینئر افسر اس حقیقت کی گواہی دے رہے تھے کہ وزیراعظم کو متعدد بار ''حساس'' امور سے آگاہ کیا گیا۔ماضی میں بھی ہم نے اہم واقعات کی بنیاد پر باہمی آویزش کو ''پوائنٹ آف نوریٹرن'' تک پہنچتے دیکھا۔جنگ 71ء اور سقوط مشرقی پاکستان کا تجربہ کرتے ہوئے سارا ملبہ فوج پر ڈال دیا جاتا ہے۔اس المیے کے سیاسی کردار پھولوں کے ہار ڈال کر عوام کے نعروں کا جواب دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔شیخ مجیب الرحمٰن ''بنگلہ بندھو'' بن گئے اور ذوالفقار علی بھٹو نے ''قائد عوام'' اور ''فخر ایشیاء'' کے القاب اپنا لیے۔جواب دہی کے لیے فوج کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ایک عام فہم شخص بھی سمجھتا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو نے ''ادھر ہم، اُدھر تم'' کے سیاسی بیانیہ کو فروغ دیا اور اپنے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کر لیئے اور ڈٹ کر حکومت کرتے رہے۔

کارگل کے واقعہ نے بھی تشویشناک رخ اختیار کر لیا اور وزیراعظم نے آرمی چیف کو ہٹانے کے لیے جو طریقہ اپنایا وہ ہر لحاظ سے ملکی سلامتی اور پاک افواج ایسے ادارے کے عزت و وقار کے منافی تھا۔میاں نواز شریف نے یہ حقیقت فراموش کر دی کہ وہ چند برس پہلے جنرل جہانگیر کرامت کو بھی مدت ملازمت مکمل ہونے سے قبل محض روایتی گفتگو کرنے کی ''پاداش'' میں رخصت کر چکے ہیں۔جنرل پرویز مشرف بھی چوکس تھے۔انہیں سری لنکا کے سرکاری دورے پر روانہ ہونا تھا۔اس سے قبل وزیراعظم نے انہیں چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے عہدہ کی اضافی ذمہ داریاں سونپ دی تھیں۔جنرل پرویز مشرف کو فارغ کر کے اگر اپنی مرضی کا ایک اور آرمی چیف تعینات کرنا مقصود تھا تو اس کا ایک ''شریفانہ'' طریقہ بھی موجود تھا۔میاں نواز شریف نے آرمی چیف کو سری لنکا سے واطن واپسی پر ''دوران سفر'' برطرف کرنے کا فیصلہ کیا اور بچگانہ انداز میں احکامات صادر کر دیئے۔نیا آرمی چیف لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کو تعینات کیا گیا۔جنرل ضیاء الدین آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل تھے اور ان کا تعلق کور آف انجینئرز سے تھا۔ان کا شمار اعلیٰ پیشہ وارانہ صلاحیت کے حامل افسروں میں ہوتا تھا۔موصوف سابق آرمی چیف جنرل مرزا اسلم بیگ کے پرنسپل سٹاف افسر بھی رہ چکے تھے۔کمانڈ، سٹاف اور اہم انسٹرکشنل خدمات بھی انجام دیں۔ہر لحاظ سے اس عہدے کے لیے موزوں تھے۔تاہم انہیں غیر تقریبی انداز میں جنرل کے رینک آویزاں کرنے سے پہلے ضرور غور کرنا چاہیے تھا کہ اس عمل سے وطن

جنرل ضیاء الحق نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے سینئر صحافی چودھری غلام حسین سے کہا:
''ہمارے پاس وردی میں بھی کالم نگار موجود ہیں''

Scanned with CamScanner

طاقت ور ممالک ہمیشہ اپنے مخالف ملکوں میں نسلی قومیت، مقامی اشتراکیت، مغربی جمہوریت، فقہی ملوکیت اور عسکری آمریت کے بل بوتے پر عوام کو بیوقوف بناتے ہیں اور اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں

عزیز بالخصوص آرمی کے افسروں اور جوانوں پر کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ چند گھنٹوں میں فوج پر ''محو پرواز'' آرمی چیف ہی کی گرفت بدستور قائم تھی۔ دوسری جانب وزیراعظم ہاؤس میں براجمان ایک اور ''آرمی چیف'' اپنی تعیناتی کو تسلیم کروانے کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

میں اپنے گھر پہنچا ہی تھا کہ آئی ایس پی آر سے میجر (بعد میں بریگیڈیئر ریٹائرڈ) عتیق الرحمٰن کی کال آئی جس میں انہوں نے نئے آرمی چیف جنرل ضیاء الدین کی تعیناتی کے بارے میں پی ٹی وی پر ٹیلی کاسٹ ہونے والی خبر کے بارے میں بتایا۔ میں نے بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) راشد قریشی کو اطلاع دی۔ وہ حیران ہوگئے اور مجھے فوراً آفس پہنچنے کے لیے کہا۔ ہم دفتر پہنچے تو جی ایچ کیو سے بھی کالز آ رہی تھیں۔ میجر جنرل راشد قریشی مجھے اپنے آفس میں بٹھا کر خود چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل (بعد میں جنرل ریٹائرڈ) محمد عزیز خان کے پاس چلے گئے۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ وزیراعظم ہاؤس سے اے ڈی سی نے بتایا کہ نئے آرمی چیف جنرل ضیاء الدین جی ایچ کیو آ رہے ہیں۔ آئی ایس پی آر کو تیج دے۔ میں نے او کے کر کے فون بند کر دیا۔ اب ہمارے دوست لیفٹیننٹ کرنل عبدالخالق چشتی سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے میرے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ سر! بات ہوگئی ہے جنرل ضیاء الدین کے ساتھ پی آر او کی ڈیوٹی میں کروں گا۔ وہ مجھے خوب جانتے ہیں۔ میں نے کہا تو پھر آپ آرمرڈ کور میس میں چلے جائیں ٹیم کے ساتھ، کیونکہ جنرل صاحب آ رہے ہیں۔

اسی دوران ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل راشد قریشی نے مجھے ''ہائی کمان'' کے فیصلے سے آگاہ کیا اور ضروری ابلاغی ہدایات دیں۔ ہائی کمان کے مطابق جنرل پرویز مشرف ہی آرمی چیف ہیں اور ان کا ہر قیمت پر دفاع کیا جائے گا۔ بدقسمتی سے نواز شریف، جنرل پرویز مشرف اور جنرل ضیاء الدین نے وطن عزیز کو شدید ترین بحران سے دوچار کر دیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو پہلے سے زیادہ پریشان ہو جاتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ فوج کی مختلف فارمیشنز متضاد احکامات کی پیروی کرتے ہوئے آپس میں الجھ جاتیں تو کیا خوفناک صورتحال پیش آتی۔

جنرل ضیاء الدین وزیراعظم ہاؤس سے سینئر افسروں کی تعیناتی کے احکامات جاری کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تھری سٹار جنرل نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ خود حیران تھے کہ آرمی چیف بیرون ملک دورے پر ہیں، یہ نواز شریف اور جنرل ضیاء الدین کو کیا ہوگیا ہے؟ سیاستدان تو خیر سیاستدان ہوتا ہے کم از کم جنرل ضیاء الدین کو تو باوقار فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ انہیں ڈی جی آئی ایس آئی کی حیثیت سے نواز شریف کی فوج کے افسروں اور جوانوں میں مقبولیت کی سطح کا بخوبی علم ہوگا۔ جنرل پرویز مشرف ہمیشہ اعلیٰ سپاہیانہ اقدار کے حامل رہے ہیں۔ ان کی

شہرت ایک باوقار پیشہ وارانہ صلاحیت کے حامل افسر کی تھی۔ انہیں اگر شک بھی ہوگیا تھا کہ وزیراعظم انہیں آرمی چیف کے طور پر ''برداشت'' نہیں کر رہے ہیں تو ایک اچھے سپاہی کی مانند دستبردار ہو

ایک یادگار تصویر کرنل صولت رضا، میجر جنرل راشد قریشی (سابق ڈی جی آئی ایس پی آر) اور سید انور محمود (سابق وفاقی سیکرٹری اطلاعات)

جاتے۔ بہرحال بڑے لوگ ہی بڑے فیصلے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک انکریمنٹ کے لیے اللہ کو حاضر ناظر جان کر جھوٹے حلف نامے داخل کیے جاتے ہیں۔ میاں نواز شریف کے بارے میں کچھ کہنا بے کار ہوگا۔ موصوف کی نظر میں جنرل محمد ضیاء الحق کے بعد کوئی آرمی چیف ٹھہرا ہی نہیں۔ اقتدار میں ہو یا حزب اختلاف میں۔ ہر مرتبہ بقول شخصے دھواں چھوڑتے ہوئے بم کو لات مارتے ہیں۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس حرکت کی ملک کتنی بھاری قیمت ادا کرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ 12 اکتوبر 1999ء کو کسی ''نیک روح'' چاہیے تھا کہ نواز شریف، پرویز مشرف اور ضیاء الدین کو اڈیالہ جیل کے ایک کمرے میں ون ڈش، ون واش اور ون لوٹا کی سہولت دے کر ایک ساتھ بند کر دیتے تو کم از کم ربع صدی تک وطن عزیز میں سکون ہی سکون رہتا۔ بر سبیل تذکرہ، یہی فارمولہ 16 دسمبر 1971ء کو بھی آزمانا چاہیے تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن 162 نشستوں کے ساتھ پہلے مغربی پاکستان کی ایک جیل میں تھے۔ ان کے ساتھ زیڈ اے بھٹو 81 نشستیں لے کر شریک ہوجاتے۔ اور اب رہ گئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل آغا محمد یحییٰ خان۔ انہیں بھی شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو کے ساتھ ایک ہی کمرے میں نظر بند کرنا چاہیے تھا۔ اس زمانے کی کمان جنرل گل حسن کی قیادت میں بھٹو صاحب پر فریفتہ تھی۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ مشرقی پاکستان کی ابتری میں بھٹو اہم ترین کردار رہے کیونکہ مجیب الرحمٰن تمام تر فسادی سوچ اور بے رحمانہ قتل و غارت کروانے

صولت رضا یوگوسلاویہ میں پاک فوج کے امن دستے کے پریس رابطہ افسر کی حیثیت سے یو این امن فوج کے سربراہ میجر جنرل شکوپس (بیلجیم) سے ایک ملاقات کے دوران

کے باوجود سیاسی لحاظ سے لاجواب بیانیہ کا مالک تھا۔ یہ بیانیہ متحدہ پاکستان قومی اسمبلی میں 160 سے

Scanned with CamScanner

جنرل آصف نواز چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سٹاف آفیسر سے ملاقات کر رہے ہیں، اس موقع پر بریگیڈیئر صولت رضا آرمی چیف سے مصافحہ کر رہے ہیں

زائد نشستیں تھیں اور صدر پاکستان نے اسے وزیراعظم بھی نامزد کر دیا تھا۔

خیر! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آج جب مڑ کر دیکھتا ہوں تو سیاست کے میدان اور حکمرانی کے ایوانوں میں پورے قد کے رہنما بہت کم اور ''بونے'' زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان حالات کے باوجود مملکت خداداد پر اللہ کریم کا رحم، کرم اور فضل ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے برسر اقتدار آتے ہی آئی ایس پی آر کے شب و روز بھی مصروف ہو گئے۔ ہمیں جنرل محمد ضیاء الحق کے دورِ حکومت کا تجربہ تھا لیکن اس مرتبہ مصروفیات کا مرکز پہلے سے مختلف تھا۔ جنرل مشرف اکثر میٹنگز میں بھرپور تیاری کے ساتھ خود شریک ہوتے تھے۔ موصوف ذاتی طور پر ایک روشن خیال، دور اندیش اور معاملہ فہم شخصیت کے حامل تھے۔ جنرل پرویز مشرف بھی جنرل ضیاء الحق کی مانند ''دہلوی'' تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والدین قیام پاکستان کے بعد کراچی تشریف لائے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کراچی ہی میں حاصل کی۔ جنرل ضیاء الحق کے والد دہلی میں سرکاری ملازم تھے لہٰذا انہوں نے زیادہ تر تعلیم دہلی ہی میں حاصل کی۔ خاص طور سے سینٹ جوزف کالج کے اساتذہ کرام کو اکثر یاد کرتے تھے۔ مارشل لاء حکمران کے حوالے سے دیکھا جائے تو از راہ تفنن بقایا دو عسکری حکمران فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور جنرل آغا محمد یحییٰ خان بھی ''دہلوی'' تھے۔ ایوب خان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہے اور جنرل یحییٰ خان انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون (بھارت) سے فارغ التحصیل تھے۔

Scanned with CamScanner

بہرحال آمدم برسر مطلب۔ جنرل پرویز مشرف کے حکم پر مانیٹرنگ سیل قائم کیا گیا جس کا مرکز ہمارا دفتر ہی تھا۔ دیگر دفاتر میں بھی عوامی شکایات موصول ہوتی تھیں جنہیں چھانٹی کے بعد متعلقہ دفاتر میں ارسال کر دیا جاتا تھا۔ آئی ایس پی آر میں مانیٹرنگ سیل کی ہفتہ وار بریفنگ میں اکثر میجر جنرل شاہد عزیز بھی تشریف لاتے تھے۔ اس وقت ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز کی ذمہ داری بھی ادا کر رہے تھے۔ موصوف کی گفتگو میں اکھڑ پن نمایاں تھا۔ میں نے میجر جنرل راشد قریشی سے درخواست کی کہ ایسے شخص کو میڈیا کے سامنے پیش نہ کیا جائے جو الجھاؤ کو سلجھاؤ پر ترجیح دیتا ہو۔ معلوم ہوا کہ موصوف کسی حوالے سے جنرل مشرف کے رشتہ دار بھی ہیں۔ یہ سن کر ہم نے اپنی سابقہ رائے پر نظر ثانی کا ارادہ کر لیا۔ میجر جنرل شاہد عزیز بعد میں چیف آف جنرل سٹاف اور لاہور کے کور کمانڈر بھی رہے۔ فوج سے ریٹائر ہوئے تو نیب کے چیئرمین بھی تعینات کیے گئے۔ جنرل پرویز مشرف کے آخری ادوار میں ہتھے سے اکھڑ گئے اور ''حق گوئی و بے باکی'' پر اتر آئے۔ جنرل مشرف کے اقتدار سے علیحدہ ہونے کے بعد مزید راز ہائے درونِ خانہ بے نقاب کرنے لگے تو مجھے اندازہ ہوا کہ میری اولین رائے درست تھی۔ آئی ایس پی آر کے سربراہ میجر جنرل راشد قریشی جنرل مشرف کے پریس سیکرٹری کے فرائض بھی ادا کر رہے تھے۔ لیفٹیننٹ حسن عماد مہدی پی آر او تھے، وہ اسلام آباد کے آفس میں ہی فرائض ادا کرتے تھے۔ البتہ میجر جنرل راشد قریشی دونوں دفاتر کی نگرانی کر رہے تھے۔ میں لیفٹیننٹ کرنل سے ترقی حاصل کر کے کرنل کے رینک پر تعینات ہوا تو دوبارہ کراچی کا غلغلہ مچ گیا۔ جنرل مشرف نے ایم کیو ایم کو بغلی تنظیم کے طور پر دوبارہ استوار کرنے کی سعی کی۔ ان کے سرکردہ بھگوڑے جب کراچی واپس آئے تو انہوں نے سابقہ آپریشنز میں شریک پولیس افسروں اہلکاروں اور مقامی ''سہولت کاروں'' سے دل کھول کر بدلے لیے۔ یہ انتہائی افسوسناک صورتحال تھی۔ الطاف حسین کی مخالف متعدد شخصیات لاہور راولپنڈی آ گئیں۔ اس طرح عام شہریوں میں بھی عدم تحفظ کا احساس بڑھنے لگا۔ تشدد اور یکطرفہ کارروائیوں کی رپورٹس کے باوجود جنرل مشرف کے ہمراہیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہیں کراچی کو ''پر امن شہر'' بنانے کے لیے ایم کیو ایم (الطاف گروپ) پر ہی بھروسہ کرنا تھا۔

جولائی 2001ء میں مجھے بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ آغاز میں امید کم تھی

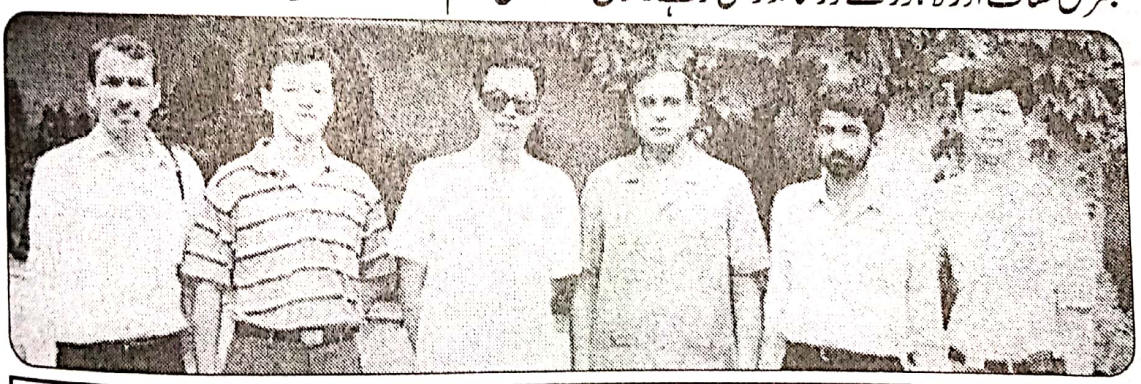

چین کے مطالعاتی دورے کے موقع پر پیپلز لبریشن آرمی کے میڈیا سیل کے افسروں کے ساتھ

Scanned with CamScanner

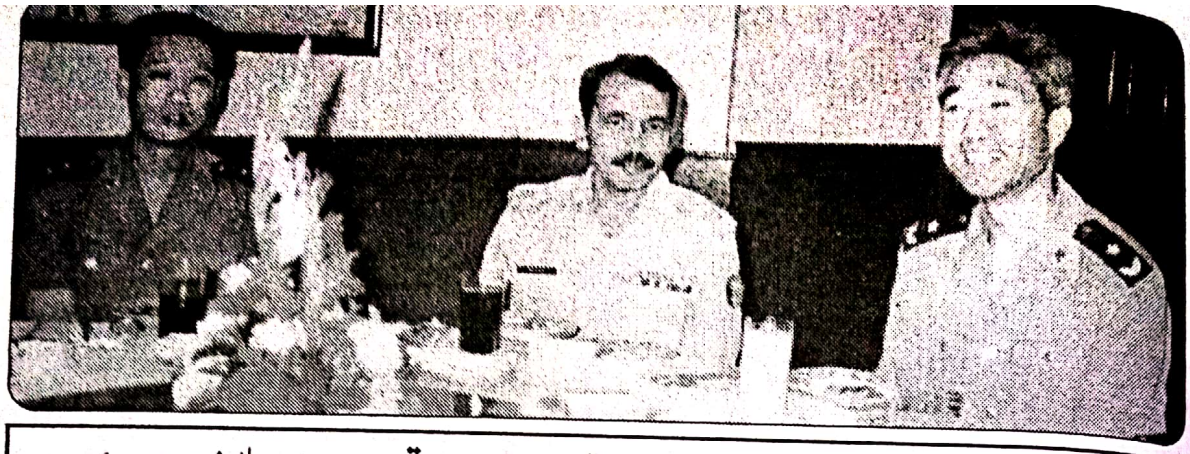

چین کی پیپلز لبریشن آرمی کے محکمہ اطلاعات کے مطالعاتی دورے کے موقع پر چین کے اعلیٰ فوجی حکام کے ہمراہ

کیونکہ اعلیٰ ترین سطح پر یہ طے ہو گیا تھا کہ آئی ایس پی آر کے ''بنیادی'' افسروں کو لیفٹیننٹ کرنل یا کرنل تک ترقی دی جائے کیونکہ یہ پرفارمنس کے لحاظ سے افسر کم اور صحافی زیادہ ہوتے ہیں۔ آئی ایس پی آر کی کارکردگی کو موثر بنانے کے لیے لازم ہے کہ ایسے افسروں کو سینئر رینک میں تعینات کیا جائے جنہوں نے ابتدائی ملازمت آئی ایس پی آر میں نہیں کی، یوں وہ فوج کے رجحانات کی بہتر عکاسی کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ کریم کی خاص مہربانی تھی کہ والدین کی دعائیں، اساتذہ کرام کے احسانات، اہل خانہ کی نیک خواہشات، دوست احباب کی حوصلہ افزائی اور سب سے بڑھ کر میرے تمام سینئرز کی شفقت تھی کہ انہوں نے فرائض کی انجام دہی میں میرے تساہل اور خامیوں کو نظر انداز کیا اور تمام جونیئرز جو مجھے کامیاب کرنے کے لیے دیانتداری سے فرائض ادا کرتے رہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جس روز میجر جنرل راشد قریشی اور میرے کولیگ کرنل منصور رشید نے بریگیڈیئر کے رینک کندھے پر لگائے اگلے روز راولپنڈی اسلام آباد شدید طوفان بادو باراں کی لپیٹ میں تھا۔ شدید بارش سے نالہ لئی میں طغیانی آ گئی، مجھے چکلالہ سکیم تھری میں عسکری فائیو کے ایک گھر میں رہنا تھا۔ یہ گھر بھی سیلاب کی زد میں آ گیا۔ گراؤنڈ منزل میں پانی بھر گیا۔ میری اہلیہ اور والد گرامی گھر میں تھے۔ پوری کالونی میں آرمی کے ریٹائرڈ اور حاضر سروس افسر قیام پذیر تھے۔ میں نے دفتر سے گھر تک پہنچنے کی پوری کوشش کی لیکن سیلابی پانی کے سامنے ایک نہ چلی۔ ریسکیو ٹیموں اور کچھ اپنی مدد آپ کے تحت کالونی کے مکینوں کو بمشکل باہر نکالا گیا۔ ہم کرنل منصور رشید کے گھر آر ڈی ننس روڈ شفٹ ہو گئے۔ پانی اترنے کے بعد گھر گئے تو صرف بالائی منزل کا سامان محفوظ تھا۔ باقی سب نالہ لئی کی نذر ہو چکا تھا۔

دفتر اور گھر میں مبارک سلامت کا سلسلہ جاری تھا۔ اکثر ناگہانی سیلاب کے باعث بے پناہ نقصان سے بھی آگاہ تھا۔ لہذا اکثر یہ جملہ دہراتے ہوئے ملاقات کرتے تھے کہ: ''بہت بہت مبارک ہو۔ بہت افسوس ہوا''۔ اور میں بہت بہت شکریہ کہہ کر خاموش ہو جاتا تھا۔

ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کی حیثیت سے معمول کے مطابق فرائض تھے۔ میں اس دفتر میں لیفٹیننٹ کی حیثیت سے 1973ء میں آیا تھا۔ تب سربراہ بریگیڈیئر رینک کے افسر تھے۔ اٹھائیس برس کے

Scanned with CamScanner

بعد اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔ چند ماہ بعد نائن الیون کا ''معرکہ'' شروع ہو گیا۔لندن میں ایک ہفتے کے دورانیہ کے کورس کے لیے نامزد ہو گیا۔ ''گورنمنٹ سپوکس پرسن'' حکومتی ترجمان کی اہلیت بڑھانا مقصود تھی۔ وفاقی محکمہ اطلاعات کی جانب سے جناب اشفاق گوندل تھے۔ہم دونوں ایک ہفتہ برطانوی وزارت دفاع کے مہمان رہے۔ اس دوران ہمیں 10 ڈاؤننگ سٹریٹ بھی لے جایا گیا جہاں وزیراعظم برطانیہ (ٹونی بلیئر) کے ڈائریکٹر کمیونی کیشن نے اپنے سیٹ اپ سے آگاہ کیا۔ہم دونوں کے علاوہ دس اور ممالک کے سول اور عسکری ابلاغی محکموں کے سرکاری افسر بھی کورس میں شریک تھے۔

31 جولائی 2003ء کو بخوشی ریٹائرمنٹ آرڈر وصول کیے۔ دراصل ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل راشد قریشی کو اچانک تبدیل کر دیا گیا۔ان کی بریگیڈیئر شوکت سلطان کو میجر جنرل کے رینک پر ترقی دے کر ڈی جی آئی ایس پی آر تعینات کر دیا گیا۔ نئے ڈی جی میرے کورس میٹ ہیں۔ ہم نے ایک ساتھ پی ایم اے کاکول میں ٹریننگ حاصل کی۔ عسکری روایات کے مطابق کورس میٹ یا جونیئر کی کمان میں فرائض منصبی ادا کرنے کی مخصوص خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔ میری نظر خامیوں پر زیادہ تھی کیونکہ آئی ایس پی آر میں منفرد طریقہ کار سے خدمات انجام دی جاتی ہیں۔ یوں میں نے میجر جنرل شوکت سلطان کو سلیوٹ کیا اور اجازت طلب کی۔ انہوں نے متعدد بار نظر ثانی کے لیے کہا تاہم میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ یوں 19 اگست 1972ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں پاس آؤٹ ہونے کے بعد 31 جولائی 2003ء کو آئی ایس پی آر سے بطور بریگیڈیئر ریٹائر ہو گیا۔ یوں میری زندگی کی کہانی کا ایک اہم ترین باب اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

ریٹائرمنٹ میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا کہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد کے ریکٹر بریگیڈیئر عزیز احمد خان نے اپنے دفتر طلب کیا اور یونیورسٹی میں ماس کمیونی کیشن ڈیپارٹمنٹ قائم کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ بریگیڈیئر عزیز احمد خان پی ایم اے کاکول میں میرے انسٹرکٹر بھی رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد متعدد اہم اداروں

ریٹائرمنٹ سے ایک روز قبل آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ میں الوداعی عصرانہ، ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل شوکت سلطان، معروف ادیب یوسف عالمگیرین و دیگر کے ہمراہ

Scanned with CamScanner

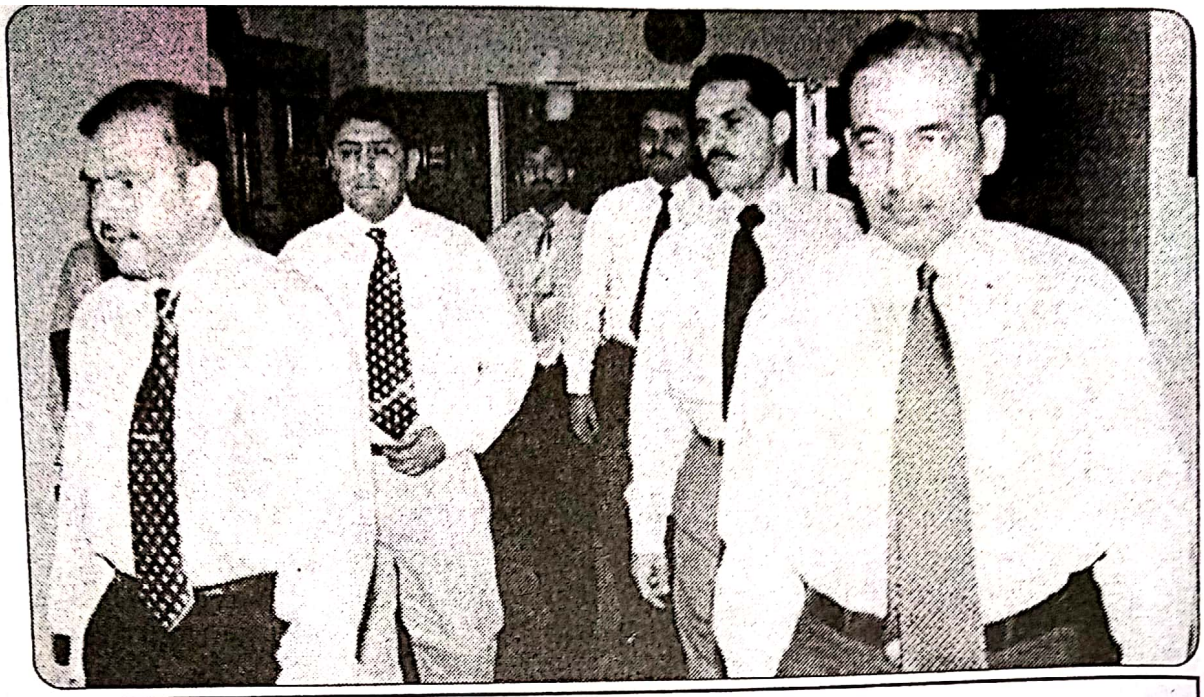

صولت رضا، ڈائریکٹر آئی ایس پی آر، ریٹائرمنٹ سے چند گھنٹے قبل الوداعی عشائیہ کے موقع پر ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل شوکت سلطان کے ہمراہ

کی جانب سے ملازمت کی پیشکش ہوئی تھی۔ میری عمر 51 برس تھی، یوں مزید نو برس سرکاری ملازمت بھی ہوسکتی تھی۔ تاہم میرے والد گرامی نے یونیورسٹی کی ڈیوٹی کو ترجیح دینے کی ہدایت کی۔ 31 جولائی 2003ء کو فوج سے ریٹائر ہوا اور پانچ اگست 2003ء کو یونیورسٹی میں بانی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھا۔ 1970ء کا پنجاب یونیورسٹی کا شعبہ صحافت کا دور واپس آ گیا لیکن اب فرائض کی ترتیب بدل چکی تھی۔ طالب علم کے بجائے فیکلٹی کا ''طالب علم'' رکن بن گیا۔ یونیورسٹی کی ملازمت 2011ء تک جاری رہی کہ اچانک ایک روز ایک نجی ٹی وی چینل (سچ نیوز چینل) کے سربراہ کی کال آئی۔ انتہائی شائستہ لہجے میں اپنائیت سے گفتگو فرما رہے تھے۔ کہنے لگے کہ ہمیں پہلے بتایا گیا تھا کہ آپ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اب ایک برس بعد پتہ چلا کہ آپ زندہ ہیں۔ دراصل وہ مجھے بریگیڈیئر صولت عباس سمجھتے رہے جو میرے سینئر تھے اور فریضہ حج ادا کرتے ہوئے انتقال کر گئے تھے۔ بہرحال ٹیلی فون کے بعد آمنا سامنا ہوا اور میں یونیورسٹی کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر نجی ٹی وی میں چیف آپریٹنگ افسر کی خدمات انجام دینے لگا۔ تقریباً ایک برس ہونے کو آیا کہ میں نے اب تمام تر توجہ ''ریٹائرڈ'' لائف کو محفوظ رکھنے پر مرکوز کی ہوئی ہے۔ یونیورسٹی اور ٹی وی میں لاتعداد واقعات اور مشاہدات پیش آئے جنہیں کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

میں آخر میں سینئر صحافی جناب مجیب الرحمٰن شامی، سینئر ایڈیٹر قومی ڈائجسٹ جناب خالد ہمایوں اور نوجوان صحافی عبدالستار اعوان کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان حضرات کی بے حد محبت کے طفیل مجھے زندگی کے ان اہم شب و روز کو محفوظ کرنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین۔

✠.....✥.....✠

Scanned with CamScanner

جنٹلمین صولت رضا، پاکستان ملٹری اکیڈمی
میں دوران تربیت 1972ء

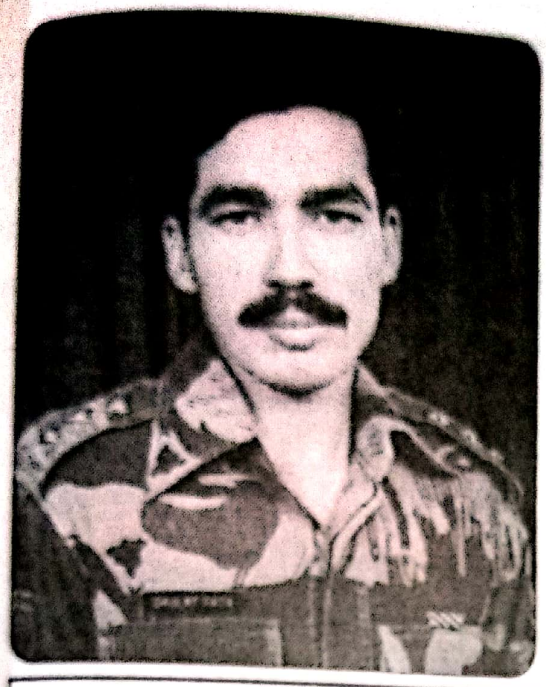

کیپٹن صولت رضا۔ پی آر او
(آئی ایس پی آر کوئٹہ)۔1976ء

ایام رفتہ کے نقوش

بطور پبلک ریلیشنز آفیسر۔ آئی ایس پی آر
کور ہیڈ کوارٹر لاہور۔1985ء

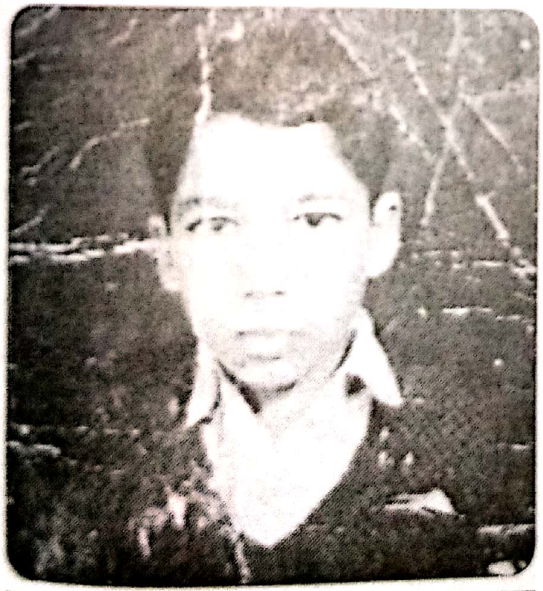

طالب علم صولت رضا، جماعت نہم
ڈی پی نیشنل ہائی سکول، لائنز ایریا کراچی

Scanned with CamScanner

MONTHLY **QAUMI DIGEST** LAHORE CPL NO 175

Scanned with CamScanner